يَآ اَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ (5:67)

اے رسولؐ! اِس ضابطۂ حیات کو جو تُمہارے ربّ کی طرف سے تُم پر نازل کیا گیا ہے تمام اِنسانوں تک پہنچا دو۔

ہماری تاریخ میں کیا ہے؟

(امت کے خلاف سازش کی ایک اور کڑی)

ادارہ طلوعِ اسلام

25/بی، گُلبرگ 2، لاہور۔ فون: 042-35714546

Email: idara@toluislam.com

Web: www.toluislam.com

قرآنی حقائق کو سمجھنے کے لئے

ماھنامہ

طلوعِ اسلام

خود پڑھیئے،

دُوسروں کو پڑھنے کے لیے پیش کیجئے

یہ

ایک ماہنامہ ہی نہیں بلکہ ایک زندہ اور زندگی بخش تحریک ہے جس کا مقصد قرآنی فکر کو اس طرح عام کرنا ہے کہ وہ نوجوانوں کے دِل کی گہرائیوں میں اُتر جائے اور وہاں سے

صحیح آسمانی انقلاب بن کر اُبھرے!

سالانہ زرشرکت اندرون ملک -/300 روپے۔ بیرون ملک -/2000 روپے

رقم بذریعہ منی آرڈر۔ بینک ڈرافٹ

بنام ادارہ طلوع اسلام 25-B گلبرگ 2، لاہور ارسال فرمائیں۔

بینک اکاؤنٹ نمبر 7-3082 برانچ کوڈ 0465

نیشنل بنک آف پاکستان۔ مین مارکیٹ گلبرگ، لاہور۔

ہماری تاریخ

(ہم نے جب روایات (احادیث) کے متعلق لکھا کہ وہ کس طرح جمع اور مرتب کی گئیں اور دین کا ذریعہ علم ہونے کی جہت سے وہ کس قدر غیر یقینی اور ظنی ہیں، تو بعض احباب نے ہمیں لکھا کہ صدرِ اول (عہدِ نبی اکرم ﷺ اور خلافتِ راشدہ) میں اسلامی نظام عملاً قائم ہوا تھا، اس لئے اس دور کی تاریخ تو یقینی ذریعہ علم ہوسکتی ہے۔ اس سے ہمیں اس نظام کی عملی تفاصیل معلوم ہوسکتی ہیں۔ ان سے کیوں نہ راہنمائی حاصل کی جائے۔ اس سے یہ حقیقت سامنے آئی کہ جس طرح ہماری قوم کے دانشوروں نے حدیث سے متعلق لٹریچر کا مطالعہ نہیں کیا، اسی طرح انہیں ہماری تاریخ کے متعلق بھی صحیح معلومات حاصل نہیں۔ ذیل کے مقالہ سے یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ ہماری تاریخ، اسلام کے صدرِ اول کا کس قسم کا نقشہ پیش کرتی ہے۔ واضح رہے کہ جس طرح احادیث میں جامعہ امام بخاریؒ کو اولیت حاصل ہے اسی طرح تاریخ میں اولیت امام ابن جریر طبریؒ کو حاصل ہے۔ اس مقالہ کے مندرجات اکثر و بیشتر، بخاریؒ اور طبریؒ پر مشتمل ہیں۔ ان کا غور سے مطالعہ فرمائیے۔)

تاریخ بھی عجیب دودھاری تلوار ہے۔ اگر کسی قوم کے پاس اس کی صحیح تاریخ موجود ہے تو وہ قوم اپنے ماضی کے تجربات کے آئینہ میں اپنے حال کو درخشند اور مستقبل کو تابندہ بنا سکتی ہے۔ لیکن اگر اس کی تاریخ غلط ہے تو وہ غلط فہمیوں اور خوش عقیدتیوں کی ایسی اندوہناک تاریکیوں میں گھری رہتی ہے جن سے اس کا نکلنا محال ہو جاتا ہے۔ ہمارے ساتھ یہی ہوا ہے۔ ہمارے زوال کے اسباب میں بنیادی عنصر ہماری غلط تاریخ ہے۔

قرآن فہمی کے راستہ میں روک

ہمارے پاس خدا کی کتاب ہے جس کے متعلق ہمارا ایمان ہے (اور علیٰ وجہ البصیرت اور مبنی علی الحقیقت ایمان) کہ وہ ایک ایسا ضابطۂ حیات ہے جو زندگی کے ہر گوشے اور ہر زمانے میں ہماری صحیح راہنمائی کرنے کے لئے مکمل اور کافی ہے۔ اگر ہم اس کا اتباع کریں تو ہمیں اقوامِ عالم کی امامت مل سکتی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ قرآن کی راہنمائی ہمارے لئے اسی صورت میں نفع بخش ہوسکتی ہے جب ہم اسے سمجھیں لیکن قرآن کو صحیح طور پر سمجھنے کے راستہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہماری غلط تاریخ ہے۔ یہ بات شاید آپ کے نزدیک تعجب انگیز اور حیرت خیز ہو لیکن جب حقائق آپ کے سامنے آئیں گے تو آپ اس کی صداقت کو بلا تامل تسلیم کرلیں گے۔ قبل اس کے کہ ہم اس کی کچھ مثالیں آپ کے سامنے پیش کریں، تمہیداً یہ بتا دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ تاریخ کس طرح قرآن کا راستہ روک کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ مثلاً قرآنِ کریم جس معاشرہ کی تشکیل کرتا ہے۔ اس کے افراد (جماعتِ مومنین) کی خصوصیات میں یہ بھی بتاتا ہے کہ:

مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (2:3)

جو کچھ انہیں خدا کی طرف سے سامانِ زیست ملتا ہے وہ اسے نوعِ انسانی کی فلاح و بہبود کے لئے کھلا رکھتے ہیں۔

دوسرے مقام پر اس کھلا رکھنے یا دوسروں کو دے دینے کی تصریح ان الفاظ سے کردی کہ:

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۬ ..... (2:219)

اے رسول! جماعتِ مومنین کے افراد تجھ سے دریافت کرتے ہیں کہ ہم اپنے مال و دولت میں سے کس قدر دوسروں کو دیں؟

جواب میں کہا گیا۔

قُلِ الْعَفْوَ ..... (2:219)

ان سے کہہ دو کہ جس قدر تمہاری ضرورت سے زائد ہے سب کا سب۔

ان آیات سے واضح ہے کہ قرآنی معاشرہ میں افرادِ معاشرہ اپنی محنت کی کمائی میں سے صرف اسی قدر اپنے پاس رکھ سکتے ہیں جو ان کی ضروریات کو پورا کر سکے۔ اس سے زائد قرآنی نظام (یا اسلامی مملکت) میں چلا جائے گا جو اسے نوعِ انسان کی ربوبیت (پرورش) کے لئے صرف کرے گا۔ ان آیات کا مفہوم سمجھنے میں نہ کوئی دِقت پیش آتی ہے نہ دشواری۔ نہ ان میں کوئی اشکال ہے نہ اغلاق۔ لیکن آپ جب یہ آیات کسی کے سامنے پیش کریں تو وہ جواب میں کہہ دیتا ہے کہ فلاں صحابیؓ کے پاس لاکھوں درہم و دینار تھے۔ فلاں کے پاس چاندی اور سونے کے ڈھیر لگے رہتے تھے۔ فلاں کے پاس کارواں درکارواں سامانِ تجارت رہتا تھا۔ اگر کوئی شخص ضرورت سے زائد دولت اپنے پاس رکھ سکتا تو ان حضرات کے پاس اس قدر دولت کیوں جمع رہتی تھی۔ اس کے بعد سلسلۂ کلام کچھ اس انداز کا ہوتا ہے۔

وہ صاحب:۔ فرمائیے! صحابہ کبارؓ قرآن کو صحیح طور پر سمجھتے تھے یا آپ بہتر سمجھتے ہیں؟

آپ:۔ میں تو کبھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں صحابہ کبارؓ سے زیادہ قرآن سمجھتا ہوں۔

وہ صاحب:۔ کیا صحابہ کبارؓ قرآن کے مطابق زندگی بسر کرتے تھے یا ان کا عمل اس کے خلاف تھا؟

آپ:۔ معاذ اللہ! میں کیسے کہہ سکتا ہوں کہ ان کا عمل قرآن کے خلاف تھا۔ ان کی زندگی بالکل قرآن کے مطابق تھی۔

وہ صاحب:۔ جب ان کی زندگی قرآن کے مطابق تھی اور ان کے پاس اس قدر مال و دولت جمع رہتا تھا تو پھر آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ قرآن کی رو سے زائد از ضرورت مال افراد کے پاس نہیں رہ سکتا۔

اس منطق کا آپ کے پاس کوئی جواب نہیں ہوتا۔ سننے والے بھی فریقِ مقابل کے ساتھ

متفق ہوجاتے ہیں۔ان میں سے ہرایک سر ہلا کر کہہ دیتا ہے کہ بات بالکل ٹھیک ہے۔جب صحابہ کبارؓ کے پاس اس قدر مال و دولت تھا تو پھر یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ اسلام میں دولت جمع کرنا ممنوع ہے؟ کیا (معاذ اللہ) صحابہؓ کو اتنا قرآن بھی نہیں آتا تھا؟

نازک دلیل

آپ نے دیکھا کہ تاریخ کس طرح قرآن کے راستے میں کھڑی ہوگئی؟ آپ یہ معلوم کر کے حیران ہوں گے کہ ہمارا مروجہ اسلام تاریخ کا مرتب کردہ ہے اور اس کا بیشتر حصہ قرآن کے خلاف ہے۔مروجہ اسلام کی کسی شق کے متعلق آپ سند مانگئے۔وہ سند تاریخ سے پیش کی جائے گی۔اگر آپ کہیں کہ اس کی سند قرآن سے پیش کیجئے تو جواب میں کہہ دیا جائے گا کہ:

> ہم رسول اللہ ﷺ کی سیرتِ طیبہ اور صحابہ کبارؓ کی زندگی سے اس کی سند پیش کررہے ہیں۔اس سے بڑھ کر دین میں سند اور کیا ہوسکتی ہے؟ قرآن کے سمجھنے کے لئے سیرتِ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کبارؓ کی حیاتِ مقدسہ کا سامنے رکھنا لاینفک ہے۔اس کے بغیر قرآن سمجھ میں نہیں آسکتا۔

یہ جواب اس قدر مسکت ہے کہ اس کے بعد آپ کچھ کہہ ہی نہیں سکتے۔نتیجہ اس کا یہ کہ تاریخ' دین کی سند بن گئی ہے اور قرآنِ کریم ایصالِ ثواب کے لئے رہ گیا ہے۔اگر کبھی ایسا ہو کہ تاریخ کے کسی واقعہ کی تائید قرآن کی آیت سے مل جائے تو اس وقت قرآن کو بڑھا چڑھا کر پیش کر دیا جاتا ہے لیکن جب تاریخ اور قرآن میں تضاد ہو تو سند تاریخ کو حاصل ہوگی۔قرآن کو نہیں۔

تاریخ کی صحیح پوزیشن

جب تک ہم قرآن اور تاریخ کی صحیح صحیح پوزیشن کو نہیں سمجھتے اور انہیں اپنے اپنے مقام پر نہیں رکھتے' دین اپنی حقیقی شکل میں ہمارے سامنے نہیں آسکتا۔قرآن کا ایک ایک لفظ اپنی اصل شکل میں ہمارے پاس محفوظ ہے۔اس میں شبہ اور شک کی کوئی گنجائش نہیں۔جہاں تک تاریخ کا تعلق

ہے (خواہ وہ کتبِ احادیث میں ہو اور خواہ کتب سیر و آثار میں) اس کی پوزیشن یہ ہے کہ ان میں سے کوئی کتاب نہ رسول اللہ ﷺ نے مدون کرا کر امت کو دی۔ نہ خلفائے راشدینؓ نے انہیں مرتب کیا۔ نہ ہی ان میں سے کوئی کتاب صحابہؓ کے زمانے میں مرتب ہوئی۔ حدیث کا وہ مجموعہ جسے **اصح الکتب بعد کتاب اللہ** کہا جاتا ہے۔ (یعنی بخاری شریف) وہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے قریب اڑھائی سو سال بعد مرتب ہوا اور ''تاریخ'' کی سب سے پہلی جامع کتاب جسے ام التواریخ کہا جاتا ہے (یعنی تاریخ طبری) رسول اللہ ﷺ کی وفات کے قریب تین سو سال بعد لکھی گئی۔ اس وقت بھی کوئی تحریری ریکارڈ موجود نہیں تھا جن سے ان کتبِ احادیث و تاریخ کو مرتب کیا گیا ہو۔ یہ یکسر ان باتوں پر مشتمل تھیں جو انہوں نے اپنے ہم عصروں کی زبانی سنیں۔ یہ ہے ہماری تاریخ کی اولیں کتابوں کی پوزیشن جن سے سیرتِ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کبارؓ کی زندگی سامنے آتی ہے۔ (واضح رہے کہ نبی اکرم ﷺ کی سیرتِ طیبہ کا بیشتر حصہ اور صحابہ کبارؓ کی خصوصیاتِ کبریٰ خود قرآنِ کریم میں بھی مذکور ہیں لیکن اس وقت ہم سیرت و آثار کے اس حصے کے متعلق گفتگو کر رہے ہیں جو کتبِ احادیث و سیر وغیرہ میں موجود ہے)۔

قرآن اور تاریخ کا باہمی تعلق

قرآن اور تاریخ کی جو پوزیشن اوپر بیان کی گئی ہے۔ اس سے ہر صاحبِ بصیرت اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ جب بھی قرآن کے کسی بیان اور عہدِ محمد رسول اللہ ﷺ والذینؓ معہٗ کی تاریخ کے کسی واقعہ میں تضاد نظر آئے تو قرآن کے بیان کو صحیح اور تاریخ کے واقعہ کو غلط قرار دینا چاہئے۔ یہ ایک ایسی حقیقتِ باہرہ ہے جس کے لئے کسی دلیل و شہادت کی ضرورت نہیں۔ یہ اپنی دلیل آپ ہے۔ اب رہے تاریخ کے وہ بیانات جن کے متعلق قرآن خاموش ہے تو ایسی صورت میں بھی ہمارے لئے اصولِ کار واضح ہیں۔ یعنی:۔

(1) ہمارا ایمان ہے (اور قرآن اس کی شہادت دیتا ہے) کہ نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کبارؓ کی زندگی قرآن کی تعلیم کے مطابق تھی۔

(2) لہٰذا اگر تاریخ میں نبی اکرم ﷺ یا صحابہ کبارؓ کے متعلق کوئی ایسی بات ملتی ہے جو قرآن کی تعلیم کے خلاف ہے تو ہمیں بلا تامل کہہ دینا چاہئے کہ تاریخ کا وہ بیان صحیح نہیں۔

اس طرح دین کا صحیح تصور بھی قائم ہو جائے گا اور نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کبارؓ کی سیرت پاکیزہ اور حقیقی شکل میں ہمارے سامنے آ جائے گی۔

ایک مثال

جو کچھ ہم نے (نظری طور پر) اوپر کہا ہے وہ واضح انداز میں سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ جب تک تاریخ سے اس کی کوئی مثال نہ پیش کی جائے۔ ہم عہدِ محمد رسول اللہ والذین معہٗ (رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین) کی تاریخ سے اس قسم کی بہت سی مثالیں پیش کر سکتے ہیں لیکن چونکہ اس مقالہ میں اس کی گنجائش نہیں (اس کے لئے ایک مستقل تصنیف کی ضرورت ہے) اس لئے ہم اس ضمن میں صرف ایک واقعہ پیش کرنا کافی سمجھتے ہیں۔ یہ وہ واقعہ ہے جو اس وقت پیش آیا جب نبی اکرم ﷺ نے سفرِ آخرت اختیار فرمایا اور ہنوز آپ ﷺ کے جسدِ طیب کو سپردِ خاک بھی نہیں کیا گیا اور اس کا تعلق صحابہ کبارؓ کی اس پوری جماعت سے ہے جو اس وقت مدینہ میں موجود تھی۔

قرآن کے غیر متبدل اصول

پہلے اس سلسلہ میں، قرآن کی تعلیم کو سامنے لائیے۔ قرآن کا بنیادی اور غیر متبدل اصول یہ ہے کہ:

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ ..... (17:70)

ہم نے ہر انسانی بچہ کو، محض اس کے انسان، ہونے کی جہت سے واجب التکریم پیدا کیا ہے۔

یعنی اس میں حسب نسب، امیر، غریب، رنگ اور وطن، مذہب وملت کی کوئی تفریق نہیں۔

(2) واجب التکریم ہر انسانی بچہ ہے۔ اب رہا مختلف افراد کے مدارج کا تعین، سو اس کے لئے

اصول یہ ہے کہ:

وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ..... (46:19)

ہر ایک کا درجہ اس کے کاموں کے مطابق متعین کیا جائے گا۔

بالفاظِ دیگر مدارج کا تعین، جوہر ذاتی اور اعمال کی بنا پر ہوگا۔ اس میں بھی خاندان، قبیلہ، ذات، گوت، رشتہ داری، امارت، غرضیکہ کسی اضافی نسبت کا کوئی دخل نہیں ہوگا۔

(3) اسی اصول کے مطابق، امت میں سب سے زیادہ واجب التکریم وہ ہوگا جو قوانینِ خداوندی کا سب سے زیادہ پابند ہوگا۔ جس کی سیرت و کردار سب سے زیادہ قرآن کے مطابق ہوں گے۔

اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ..... (49:13)

ان غیر متبدل اصولوں کی رو سے قرآن نے رنگ، نسل، خون، قبیلہ، ذات وغیرہ کے تمام امتیازات ختم کر دیئے اور عزت و تکریم کا صرف ایک معیار باقی رکھا۔ یعنی جوہر ذاتی اور حسن سیرت و کردار۔

اُمت کا فریضہ

اب آگے بڑھئے۔ نبی اکرم ﷺ نے قرآنی اصولوں کے مطابق ایک معاشرہ متشکل فرمایا۔ ایک مملکت قائم کی۔ جس کا مقصد ''امر بالمعروف و نہی عن المنکر'' تھا۔ چونکہ اس نظام کو نبی اکرم ﷺ کی زندگی تک ہی نہیں رہنا تھا۔ اسے مسلسل آگے چلنا تھا کیونکہ اسی کا نام دین تھا۔ اس لئے اس مقصد کے لئے ایک امت تیار کی گئی۔ اس امت کے متعلق قرآن میں ہے:

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ..... (3:110)

تم بہترین امت ہو جسے نوعِ انسان کی بہبود کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔

تمہارا فریضۂ حیات امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہے۔

یہی وہ امت تھی جسے وراثتِ کتاب کے لئے منتخب کیا گیا تھا۔ قرآن میں ہے:

ثُمَّ اَوۡرَثۡنَا الۡكِتٰبَ الَّذِيۡنَ اصۡطَفَيۡنَا مِنۡ عِبَادِنَا ۚ ..... (35:32)

پھر ہم نے ان لوگوں کو اس کتاب کا وارث بنایا جنہیں اس مقصدِ جلیل کے لئے اپنے بندوں میں سے چنا تھا۔

یہ امت (اس زمانے میں) مہاجرین اور انصار پر مشتمل تھی جس کے پکے اور سچے ہونے کا سرٹیفکیٹ خود اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا تھا۔ سورۂ انفال میں ہے:

صحابہؓ کے فضائل

وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَهَاجَرُوۡا وَجٰهَدُوۡا فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ وَالَّذِيۡنَ اٰوَوۡا وَّنَصَرُوۡۤا اُولٰٓئِكَ هُمُ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ حَقًّا ؕ لَهُمۡ مَّغۡفِرَةٌ وَّرِزۡقٌ كَرِيۡمٌ (8:74)

اور جو ایمان لائے اور انہوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا اور جنہوں نے (انہیں) پناہ دی اور ان کی مدد کی۔ یہ سب سچے اور پکے۔ حقیقی مومن ہیں۔ ان کے لئے ہر قسم کی حفاظت اور عزت کا رزق ہے۔

دوسرے مقام پر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں ایک دوسرے کی اُلفت ڈال دی تھی اور یہ وہ نعمتِ کبریٰ تھی جو ساری دنیا کی دولت خرچ کرنے پر بھی نہیں مل سکتی تھی (8:64) سورۂ توبہ میں ان کے متعلق ہے:

اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الۡخَيۡرٰتُ ۖ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ (9:88)

یہی وہ لوگ ہیں جن کے لئے ہر قسم کی بھلائیاں ہیں اور یہی ہیں جو کامیاب و کامران ہیں۔

سورۂ فتح میں خالق کائنات نے ان ''پکے اور سچے مومنین'' کی جس والہانہ انداز میں توصیف و تعریف کی ہے وہ ان حضرات کی بلندیٔ مقام کی زندہ شہادت ہے۔ دیکھئے! کہنے والے نے کس طرح جھوم جھوم کر کہا ہے:

مُحَمَّدٌ رَّسُوۡلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيۡنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الۡكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيۡنَهُمۡ

تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ۡ سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ؕ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ ۚۖ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ ۚۛ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْئَهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ ؕ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا (48:29)

اس آیۂ جلیلہ کا مفہوم یہ ہے:

محمد رسول اللہ ﷺ اور ان کے رفقاء کی جماعت بھی کیا عجیب جماعت ہے۔ ان کی کیفیت یہ ہے کہ وہ مخالفین کے مقابلہ میں چٹان کی طرح سخت ہیں اور آپس میں بڑے نرم دل اور ہمدرد۔ تو انہیں دیکھتا ہے کہ وہ کس طرح ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانے کے لئے جھک جاتے اور قوانینِ خداوندی کے سامنے پیکرِ تسلیم و رضا بن جاتے ہیں۔ لیکن وہ راہبوں کی جماعت نہیں۔ وہ خدا کے قانون کے مطابق سامانِ زیست کی طلب و جستجو میں بھی مصروفِ عمل رہتے اور زندگی کے ہر معاملہ میں قوانینِ الٰہیہ سے ہم رنگ و ہم آہنگ رہتے ہوئے اپنے اندر صفاتِ خداوندی منعکس کرتے ہیں۔ ان کے اندر صفاتِ خداوندی کی نمود سے سکون و طمانیت کی جو کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ اس کے آثار ان کے چہروں سے نمایاں ہوتے ہیں۔ ان کے یہ خصائص تورات میں بھی مذکور تھے اور انجیل میں بھی۔

انہوں نے جس طرح بتدریج اس نظامِ خداوندی کو قائم کیا ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھو جیسے عمدہ بیج سے شگوفہ نکلتا ہے تو پہلی کونپل بڑی نرم و نازک ہوتی ہے۔ پھر وہ مضبوط ہوتی چلی جاتی ہے۔ پھر جب اس کے خوشوں میں دانے پڑنے کا وقت آتا ہے تو وہ خود اپنی نالوں پر محکم اور

استوار طریق سے کھڑی ہو جاتی ہے۔ کاشتکار جب اپنی محنت کو یوں ثمر بار ہوتے دیکھتا ہے تو وجد و مسرت سے جھوم اٹھتا ہے لیکن یہی چیز اس کے دشمنوں کے سینے پر سانپ بن کر لوٹنے کا موجب بن جاتی ہے۔

اس طرح اللہ ہر اس جماعت سے جو اس کے نظام کے اَن دیکھے نتائج پر یقین رکھ کر، صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا ہو، اس کا وعدہ کرتا ہے کہ ان کی کوششوں کا ننھا سا بیج تمام خطرات سے محفوظ رہے گا اور ان کی کھیتی بہترین ثمرات کی حامل ہوگی۔

یہ تھی وہ جماعت، جس نے رسول اللہ ﷺ کے مقدس ہاتھوں تربیت پائی تھی اور جس نے حضور ﷺ کے بعد قرآنی نظام کو آگے چلانا تھا۔ اس مقصد کے لئے ان سے کہہ دیا گیا تھا کہ:

وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ..... (42:38)

وہ اپنے معاملات باہمی مشورہ سے طے کریں۔

تصریحاتِ بالا سے واضح ہے کہ:

(1) قرآنِ کریم کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ عزت و تکریم کا معیار ذاتی جوہر اور حسنِ عمل ہے نہ کہ حسب و نسب اور رشتہ داری کے تعلقات۔

(2) صحابہ کبارؓ پکے اور سچے مومن تھے۔ ان کی سیرت بہت بلند اور کردار بڑا پاکیزہ تھا۔ ان کے دلوں میں ایک دوسرے کی محبت پیوست تھی۔

(3) قرآنی نظام کو قائم رکھنا اور آگے چلانا امت کا اجتماعی فریضہ ہے۔ اس کے لئے وہ باہمی مشورہ سے اپنے میں سے بہترین فرد کو (جو معیارِ خداوندی پر پورا اترے) منتخب کر کے، رسول ﷺ کا جانشین (یعنی مملکت کا سربراہ) بنائیں گے۔ اسے خلافت علیٰ منہاجِ رسالت کہتے ہیں۔

امت کے لئے قرآن کے ان اصولوں پر عمل کرنے کا پہلا موقعہ، رسول اللہ ﷺ کی وفات

کے فوری بعد پیدا ہو گیا۔ یعنی خلیفہ کا انتخاب۔

یہ تھی قرآنِ کریم کی تعلیم اور قرآن کی رو سے صحابہ کبارؓ (جماعتِ انصار و مہاجرین) کی خصوصیاتِ کبریٰ۔ اب دیکھئے کہ تاریخ اس باب میں کیا کہتی ہے۔

☆.....☆.....☆

خلافت کے متعلق حضرت عباسؓ اور حضرت علیؓ کے خیالات

بخاری (باب وفات النبی ﷺ) میں حضرت عبداللہ ابنِ عباسؓ کی روایت سے حسبِ ذیل واقعہ بیان کیا گیا ہے:

> اس بیماری میں جس میں آپ ﷺ نے وفات فرمائی۔ علی ابن طالبؓ رسول اللہ ﷺ کے پاس سے باہر آئے تو لوگوں نے ان سے پوچھا۔ ابو الحسن! رسول اللہ ﷺ نے کس حالت میں صبح فرمائی؟ حضرت علیؓ نے جواب دیا کہ الحمد للہ اچھی حالت میں صبح فرمائی ہے۔ تو عباسؓ بن عبدالمطلب ان کا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف کو لے گئے اور ان سے کہنے لگے۔ خدا کی قسم تین دن کے بعد تم لاٹھی کے غلام ہو گے۔ بخدا میرا یہ خیال ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا اپنی اس بیماری میں انتقال ہو جائے گا۔ میں خوب پہچانتا ہوں کہ عبدالمطلب کی اولاد کے چہرے مرتے وقت کیسے ہوتے ہیں۔ چلو رسول اللہ ﷺ کے پاس چلیں اور آپ سے دریافت کر لیں کہ آپ ﷺ کے بعد حکومت کن لوگوں میں ہو گی۔ اگر ہم میں ہوئی تو ہمیں معلوم ہو جائے گا اور اگر ہمارے سوا دوسروں میں ہوئی تو بھی ہمیں معلوم ہو جائے گا اور آپ ﷺ اپنے جانشین کو ہمارے حق میں وصیت فرما دیں گے (اس[1] پر حضرت علیؓ نے فرمایا کہ کیا اس امر کی طمع ہمارے سوا کسی

[1] بین القوسین عبارت بخاری میں نہیں ہے مگر علامہ عینیؒ نے مراسیل شعبی سے اس اضافہ کو نقل کیا ہے۔

دوسرے کو بھی ہوسکتی ہے؟ عباسؓ نے فرمایا کہ میرا خیال ہے کہ خدا کی قسم ایسا ضرور ہوگا) اس پر علیؓ نے کہا کہ خدا کی قسم اس بارہ میں اگر ہم نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھ لیا اور آپ ﷺ نے انکار کر دیا تو آپ ﷺ کے بعد لوگ پھر ہمیں حکومت کبھی بھی نہیں دیں گے۔ خدا کی قسم میں اس بات کو رسول اللہ ﷺ سے ہرگز نہیں پوچھوں گا۔

(صحیح بخاری، باب وفات النبی ﷺ)

اس روایت سے ظاہر ہے کہ ابھی حضور ﷺ کا انتقال بھی نہیں ہوا تھا کہ حضور ﷺ کے چچا حضرت عباسؓ اور چچا زاد بھائی اور داماد حضرت علیؓ کے دل میں خلافت کا خیال پیدا ہو گیا تھا۔ حضرت علیؓ مطمئن تھے کہ خلافت کسی اور کے پاس نہیں جائے گی۔ لیکن حضرت عباسؓ کا اندازہ کچھ اور تھا۔ اس لئے وہ اس بارے میں نبی اکرم ﷺ سے (خلافتِ حضرت علیؓ کے متعلق) توثیق کرالینا چاہتے تھے۔ اس پر حضرت علیؓ نے جو جواب دیا وہ قابلِ غور ہے۔ یعنی اگر ہم نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھ لیا اور آپ ﷺ نے انکار کر دیا تو پھر ہمارے لئے کوئی گنجائش (Chance) نہیں رہے گی۔

شیعہ حضرات کے ہاں یہ عقیدہ ہے کہ جس طرح نبوت خدا کی طرف سے وہبی طور پر ملتی ہے اور اس میں انتخاب اور مشورہ کا کوئی سوال نہیں، اسی طرح خلافت (امامت) بھی خدا کی طرف سے موہبت ہے۔ اس میں انتخاب وغیرہ کا کوئی سوال نہیں۔ امام، خدا کی طرف سے منصوص اور مامور ہوتا ہے، یہ امامت حضرت علیؓ اور آپ کی اولاد، خدا کی طرف سے مقرر کردہ ہے۔

لیکن سُنّی حضرات کا یہ عقیدہ نہیں۔ ان کے نزدیک، خلیفہ اُمت کے مشورہ سے منتخب ہوتا ہے۔ نہ ہی خلافت کوئی جائیداد ہے۔ جو متوفی کے بعد اس کے رشتہ داروں کو بطورِ ترکہ مل سکتی ہے۔ یہ تصور کہ حکومت باپ کے بعد بیٹے کو ورثہ میں ملتی ہے، ملوکیت ہے جسے مٹانے کے لئے اسلام آیا تھا۔

اگر اس روایت کو صحیح مانا جائے تو.....

جو روایت اوپر درج کی گئی ہے وہ شیعہ حضرات کی نہیں، سنیوں کی حدیث کی سب سے معتبر کتاب بخاری میں درج ہے۔ اب آپ غور فرمائیے کہ اگر اس حدیث کو صحیح مان لیا جائے تو رسول اللہ ﷺ کے قریب ترین صحابہؓ (حضرت عباسؓ اور حضرت علیؓ) کے متعلق کیا تصور قائم ہوتا ہے؟ یہ تصور کہ وہ (معاذ اللہ) اسلام کے ابتدائی اور بنیادی اصول کو بھی نہیں سمجھ سکے تھے کہ خلافت بطورِ وراثت یا استحقاق نہیں ملتی۔ یہ معاملہ امت کے باہمی مشورہ سے طے ہوتا ہے، پھر جو جواب، حضرت علیؓ کی طرف منسوب کیا گیا ہے اس سے ان کی سیرت و کردار پر جو زد پڑتی ہے وہ بھی کسی تشریح کی محتاج نہیں۔

سقیفہ بنی ساعدہ کا اجتماع

اب آگے بڑھیئے۔ نبی اکرم ﷺ اس دنیا سے تشریف لے گئے۔ چونکہ خلافت (جانشینی رسول ﷺ) کا معاملہ امت کے باہمی مشورہ سے طے ہونا تھا۔ اس لئے حضور ﷺ نے اس کے متعلق کوئی وصیت نہیں فرمائی تاکہ امت کی آزادئ رائے پر کسی قسم کی پابندی عائد نہ ہو جائے۔ چونکہ یہ معاملہ بہت اہم تھا۔۔۔ مرکزِ ملت کے بغیر دین کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔۔۔ اس لئے ایسا نظر آتا ہے کہ امت نے حضور ﷺ کی تجہیز و تکفین سے بھی پہلے اسے طے کر لینا ضروری سمجھا۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ سقیفہ بنی ساعدہ میں انصار کا اجتماع ہوا۔ جس میں حضرت سعد بن عبادہؓ کو خلافت کا امیدوار قرار دیا گیا۔ ایک روایت کے مطابق وہاں یہ تجویز بھی سامنے لائی گئی کہ ایک امیر انصار میں سے ہو اور ایک مہاجرین میں سے۔ اس وقت مہاجرین (حضرت ابوبکرؓ۔ حضرت عمرؓ اور دیگر صحابہؓ) بھی وہاں پہنچ گئے۔ اس اجتماع کی جو روئیداد تاریخ میں بیان ہوئی ہے وہ قابلِ غور ہے۔ کہا گیا ہے کہ (انصار میں سے) حضرت حباب بن منذرؓ نے حسبِ ذیل تقریر فرمائی:

حضرت حبابؓ کی تقریر

اے انصار! امارت اپنے ہاتھوں ہی میں رکھو' کیونکہ لوگ تمہارے مطیع رہیں۔ کسی شخص میں یہ جرأت نہ ہوگی کہ وہ تمہارے خلاف آواز اٹھا سکے یا تمہاری رائے کے خلاف کوئی کام کر سکے۔ تم اہل عزت وثروت ہو۔ تم تعداد اور تجربے کی بنا پر دوسروں سے بڑھ چڑھ کر ہو۔ تم بہادر اور دلیر ہو' لوگوں کی نگاہیں تمہاری طرف لگی ہوئی ہیں۔ ایسی حالت میں تم ایک دوسرے کی مخالفت کر کے اپنا معاملہ خراب نہ کرو۔ یہ لوگ تمہاری بات ماننے پر مجبور ہیں۔ زیادہ سے زیادہ رعایت جو ہم انہیں دے سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ ایک امیر ہم میں سے ہو اور ایک ان میں سے۔''

(محمد حسین ہیکل کی کتاب۔ ''ابوبکرؓ صدیقِ اکبر''۔ ص107)[1]

آپ نے غور فرمایا۔ ہماری تاریخ کا یہ بیان ان انصار (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) کے متعلق ہے جن کے مہاجرین کے ساتھ فدائیانہ تعلقات اور بے لوث ایثار کی شہادت خود اللہ تعالیٰ نے دی ہے۔ (تاریخ کے بیان کے مطابق) ان کی طرف سے ان جذبات کا اظہار اس وقت ہو رہا ہے جب نبی اکرم ﷺ کی نعش مبارک بھی ہنوز آنکھوں کے سامنے ہے۔

حضرت عمرؓ کی تقریر

یہ تو رہا انصار کے متعلق۔ اب مہاجرین کی بابت سنئے (تاریخ بتاتی ہے کہ) اس کے جواب میں حضرت عمرؓ نے حسبِ ذیل تقریر فرمائی:

ایک میان میں دو تلواریں جمع نہیں ہو سکتیں۔ اللہ کی قسم! عرب تمہیں امیر بنانے پر ہرگز رضامند نہ ہوں گے۔ جب رسول اللہ ﷺ تم میں سے نہ تھے۔ ہاں! اگر امارت ان لوگوں کے ہاتھوں میں آئے جن میں رسول

1. یہ تمام واقعات طبری کی تاریخ میں مذکور ہیں۔

اللہ ﷺ مبعوث ہوئے تھے تو انہیں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ اگر عربوں کے کسی طبقے نے ہماری امارت اور خلافت سے انکار کیا تو اس کے خلاف ہمارے ہاتھ میں دلائل ظاہرہ اور براہین قاطعہ ہوں گے۔ رسول اللہ ﷺ کی جانشینی اور امارت کے بارے میں کون شخص ہم سے جھگڑا کر سکتا ہے۔ جب ہم آپ کے جاں نثار اور اہل عشیرہ ہیں۔ اس معاملہ میں ہم سے جھگڑا کرنے والا وہی شخص ہوسکتا ہے جو باطل کا پیروکار۔ گناہوں سے آلودہ اور ہلاکت کے گڑھے میں گرنے کے لئے تیار ہو۔

(ابوبکر صدیقؓ از ہیکل، ص108)

اس کے جواب میں حضرت حبابؓ نے انصار سے کہا:

اے انصار!۔۔۔تم ہمت سے کام لو اور عمرؓ اور اس کے ساتھیوں کی بات نہ سنو! اگر تم نے اس وقت کمزوری دکھائی تو یہ سلطنت میں سے تمہارا حصہ غصب کرلیں گے۔ اگر یہ تمہاری مخالفت کریں تو انہیں یہاں سے جلاوطن کردو اور سلطنت پر خود قابض ہو جاؤ۔ کیونکہ اللہ کی قسم! تمہی اس کے سب سے زیادہ حقدار ہو۔ تمہاری ہی تلواروں کی بدولت اسلام کو شان وشوکت نصیب ہوئی ہے اس لئے اس کی قدر ومنزلت کا موجب تمہی ہو۔ تمہی اسلام کو پناہ دینے والے اور اس کی پشت پناہ ہو اور اگر تم چاہو تو اسے اس کی شان وشوکت سے محروم بھی کر سکتے ہو۔ (ایضاً، ص109-108)

اندازِ گفتگو؟

حضرت عمرؓ نے یہ فقرہ سنا تو کہا:

اگر تم نے اس قسم کی کوشش کی تو اللہ تمہیں ہلاک کر ڈالے گا۔

(ایضاً، ص109)

اس کے جواب میں حضرت حبابؓ نے کہا:

ہمیں نہیں اللہ تمہیں ہلاک کرے گا۔ (ایضاً، ص 109)

یہ ہے ہماری تاریخ کے مطابق ان صحابہؓ کے باہمی تعلقات کا نقشہ جن کے متعلق اللہ تعالیٰ یہ سرٹیفکیٹ عطا فرماتا ہے کہ:

اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ ..... (48:29)

وہ کفار کے مقابلہ میں بڑے سخت اور آپس میں بڑے ہمدرد تھے۔

وہ جن کے متعلق خدا کا ارشاد ہے کہ:

وَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ ..... (8:63)

ان کے دلوں میں خدا نے باہمی محبت اور الفت ڈال دی۔ وہ محبت اور الفت جو دنیا بھر کی دولت دے کر بھی خریدی نہیں جا سکتی۔

ان صحابہؓ کے باہمی تعلقات اور اخلاق کے متعلق ہماری تاریخ یہ نقشہ پیش کرتی ہے۔

حضرت عمرؓ کی جو تقریر (تاریخ کے بیان کے مطابق) اوپر درج کی گئی ہے اس میں انہوں نے اپنے (یعنی مہاجرین کے) حقِ خلافت کے متعلق یہ دلیل دی ہے کہ:

رسول اللہ ﷺ کی جانشینی اور امارت کے بارے میں ہم سے کون جھگڑ سکتا ہے۔ جب ہم آپ کے جاں نثار اور اہلِ عشیرہ (اہل خاندان) ہیں۔

یہ دلیل قابلِ غور ہے۔ اس سے پیشتر ہم دیکھ چکے ہیں کہ تاریخ ہمیں حضرت عباسؓ اور حضرت علیؓ کے متعلق یہ باور کرانا چاہتی ہے کہ ان کے نزدیک خلافت حضور ﷺ کے قرابت داروں کو ورثہ میں ملنی چاہئے تھی۔ اب حضرت عمرؓ کے متعلق یہ بتایا جاتا ہے کہ انہوں نے بھی استحقاقِ خلافت کے لئے یہی دلیل دی کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے اہل خاندان ہیں۔ غور کیجئے کہ اس سے ہماری تاریخ ہمیں کہاں لے جانا چاہتی ہے۔

الائمۃ من قریش

لیکن تاریخ یہیں تک نہیں رہتی۔ وہ ایک قدم آگے بڑھاتی ہے اور بتاتی ہے کہ جب معاملہ زیادہ نزاکت اختیار کر گیا تو حضرت ابوبکرؓ اٹھے اور آپ نے فرمایا کہ اس باب میں انصار کا دعویٰ یکسر بے بنیاد ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فیصلہ کر دیا ہوا ہے کہ **الائمہ من قریش** ''خلافت قریش میں رہے گی''۔ اس پر انصار خاموش ہو گئے اور حضرت ابوبکرؓ خلیفہ منتخب کر لئے گئے۔

یہ حدیث' متفق علیہ طور پر صحیح مانی جاتی ہے لیکن آپ ذرا اس کی گہرائی میں جائیے اور سوچئے کہ یہ کبھی رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہو سکتا ہے؟ قرآن مسلسل و متواتر نسل اور خون کے امتیازات مٹا کر مساواتِ انسانیہ اور تکریم آدمیت کی تعلیم دیتا رہا۔ حضور ﷺ کی ساری زندگی اس بلند و برتر تعلیم کا عملی نمونہ رہی۔ آپ اس امر کا تصور بھی کر سکتے ہیں کہ اس تعلیم کا حامل رسول ﷺ یہ فیصلہ کرے گا کہ حکومت میرے قبیلہ کے اندر رہے گی۔ یہ ایک روایت قرآن کی بنیادی تعلیم اور نبی اکرم ﷺ کے اسوۂ حسنہ کو باطل قرار دے دینے کے لئے کافی ہے۔ لیکن ہماری تاریخ اس روایت کو رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کرتی ہے اور یہ کہتی ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے انصار اور مہاجرین کے بھرے مجمع میں اسے حق خلافت کے لئے بطور دلیل پیش کیا اور اسے سب نے تسلیم کر لیا۔ یعنی ہماری تاریخ' ایک ہی واقعہ میں' خدا کے رسول ﷺ اور..... صحابہ کبارؓ کے متعلق نسل پرستی کا ایسا تصور پیدا کر جاتی ہے جسے مٹانے کے لئے قرآن آیا تھا۔

رسول اللہ ﷺ کی وفات کے فوری بعد' صحابہ کبارؓ (انصار و مہاجرین) کا جو پہلا اجتماع ہوا' اس میں ہماری تاریخ کے مطابق ان حضرات کے باہمی تعلقات' اندازِ گفتگو اور اسلوبِ دلائل کا نقشہ ہمارے سامنے آ گیا۔ اب اس سے آگے بڑھئے۔ (امام) طبریؒ اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں:

دست و گریباں

سابقہ روایت کے سلسلہ سے عبداللہؓ بن عبدالرحمٰن سے مروی ہے کہ اب

ہر طرف سے لوگ آ آ کر ابوبکرؓ کی بیعت کرنے لگے۔ قریب تھا کہ وہ سعدؓ کو روند ڈالتے۔ اس پر سعدؓ کے کسی آدمی نے کہا کہ سعدؓ کو بچاؤ ان کو نہ روندو، عمرؓ نے کہا اللہ اسے ہلاک کرے اس کو قتل کر دو اور خود ان کے سرہانے آ کر کھڑے ہو گئے اور کہا کہ میں چاہتا ہوں تم کو روند کر ہلاک کر دوں۔ سعدؓ نے عمرؓ کی داڑھی پکڑ لی عمرؓ نے کہا چھوڑ دو اگر اس کا ایک بال بھی بیکا ہوا تو تمہارے منہ میں ایک دانت نہ رہے گا۔ ابوبکرؓ نے کہا عمرؓ خاموش رہو اس موقع پر نرمی برتنا زیادہ سودمند ہے۔ عمرؓ نے سعدؓ کا پیچھا چھوڑ دیا۔ سعدؓ نے کہا اگر مجھ میں اٹھنے کی بھی طاقت ہوتی تو میں تمام مدینے کے گلی کوچوں کو اپنے حامیوں سے بھر دیتا کہ تمہارے اور تمہارے ساتھیوں کے ہوش وحواس جاتے رہتے اور بخدا اس وقت میں تم کو ایسی قوم کے حوالے کر دیتا جو میری بات نہیں مانتے بلکہ میں ان کا اتباع کرتا۔ اچھا اب مجھے یہاں سے اٹھا لے چلو۔ ان کے آدمیوں نے ان کو اٹھا کر ان کے گھر میں پہنچا دیا۔ چند روز ان سے تعارض نہیں کیا گیا۔ اس کے بعد ان سے کہلا بھیجا کہ چونکہ تمام لوگوں نے اور خود تمہاری قوم نے بھی بیعت کر لی ہے تم بھی آ کر بیعت کر لو۔ سعدؓ نے کہا یہ نہیں ہو سکتا تاوقتیکہ میں تمہارے مقابلہ میں اپنا ترکش خالی نہ کر دوں۔ اپنے نیزے کو تمہارے خون سے رنگین نہ کر لوں اور اپنی تلوار سے جس پر میرا بس چلے وار نہ کر لوں اور اپنے خاندان اور قوم کے ان افراد کے ساتھ جو میرا ساتھ دیں تم سے لڑ نہ لوں، ہرگز بیعت نہ کروں گا۔ خدا کی قسم اگر انسانوں کے ساتھ جن بھی تمہارے ساتھ ہو جائیں تب بھی جب تک کہ میں اپنے معاملے کو اپنے رب کے سامنے پیش نہ کر لوں بیعت نہیں کروں گا۔

(تاریخ طبری، جلد اول، حصہ چہارم، اردو ترجمہ، شائع کردہ، جامعہ عثمانیہ، ص 7)

اس سے ایک صفحہ آگے ہے:

معاذ اللہ!

ضحاک بن خلیفہ سے مروی ہے کہ امارت کے انتخاب کے موقع پر حباب بن المنذ رؓ نے کھڑے ہو کر تلوار نکال لی اور کہا کہ میں ابھی اس کا تصفیہ کر دیتا ہوں۔ میں شیر ہوں اور شیر کی کھوہ میں ہوں اور شیر کا بیٹا ہوں۔ عمرؓ نے اس پر حملہ کیا اور اس کے ہاتھ پر وار کیا۔ تلوار گر پڑی' عمرؓ نے اسے اٹھا لیا اور پھر سعدؓ پر جھپٹے اور لوگ بھی سعدؓ پر جھپٹے۔ اب سب نے باری باری آ کر بیعت کی۔ سعدؓ نے بھی بیعت کی۔ اس وقت عہدِ جاہلیت کا سا منظر پیش آیا اور تو تو میں میں ہونے لگی۔ ابوبکرؓ اس سے دور رہے' جس وقت سعدؓ پر لوگ چڑھ گئے کسی نے کہا کہ تم لوگوں نے سعدؓ کو مار ڈالا۔ عمرؓ نے کہا اللہ اسے ہلاک کر دے۔ وہ منافق ہے۔ عمرؓ کی تلوار کے سامنے ایک پتھر آ گیا اور ان کی ضرب سے وہ قطع ہو گیا۔

کلیجے پر ہاتھ رکھئے اور اس فقرہ کو پھر پڑھئے:

اس وقت عہدِ جاہلیت کا سا منظر پیش آیا اور تو تو میں میں ہونے لگی۔

بہر حال' حضرت ابوبکرؓ خلیفہ منتخب ہو گئے۔ اس کے بعد' دوسرے امیدوار' حضرت سعدؓ کا کیا طرزِ عمل رہا؟ سنئے:

اس کے بعد سعدؓ نہ ابوبکرؓ کی امامت میں نماز پڑھتے تھے اور نہ جماعت میں شریک ہوتے تھے۔ حج میں بھی مناسک ان کے ساتھ ادا نہیں کرتے تھے۔ ابوبکرؓ کے انتقال تک ان کی یہی روش رہی۔

(طبری' ص8)

داڑھیاں نوچنا!

ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ سقیفہ کے تنازعے میں، حضرت سعدؓ نے حضرت عمرؓ کی داڑھی پکڑ لی تھی۔ تاریخ طبریؔ ہمیں بتاتی ہے کہ ایک دوسرے کی داڑھیاں نوچنا (معاذ اللہ) ان حضرات کا معمول سا ہو گیا تھا۔ چنانچہ لکھا ہے کہ جب حضرت اسامہؓ کی امارتِ عساکر کے مسئلہ میں حضرت عمرؓ اور حضرت ابوبکرؓ میں اختلاف رائے ہوا تو

> ابوبکرؓ جو بیٹھے ہوئے تھے غصے سے اچھل پڑے اور بڑھ کر انہوں نے عمرؓ کی داڑھی پکڑ لی اور کہا۔ اے ابنِ خطاب! اللہ تیری ماں کا برا کرے کہ تم مَر جاتے۔ بھلا جس شخص کو رسول اللہ ﷺ نے اس پر فائز کیا ہے۔ تم مجھ سے کہتے ہو کہ میں اسے علیحدہ کر دوں۔

(ایضاً، ص 12)

حضرت علیؓ کا ردِ عمل

یہ جملہ معترضہ تھا۔ اب پھر انتخابِ خلیفہ اول کی تاریخی داستان کی طرف آیئے۔ اس تمام واقعہ میں حضرت علیؓ کا ابھی تک ذکر نہیں آیا۔ آپ یقیناً یہ معلوم کرنے کے لئے مشوش ہوں گے کہ جن بزرگوار (یعنی حضرت علیؓ) کے دل میں سب سے پہلے خلافت کا خیال پیدا ہوا تھا، حضرت ابوبکرؓ کے انتخاب پر ان کی طرف سے کیا ردِ عمل ہوا۔ تاریخ اس کے متعلق تفصیل سے بتاتی ہے۔ سنئے۔ محمد حسین ہیکلؔ (مصری) اپنی کتاب میں لکھتا ہے:

> مہاجرین اور انصار کے چند افراد حضرت ابوبکرؓ کی بیعت میں شامل نہ تھے بلکہ ان کا میلان حضرت علیؓ بن ابی طالب کی طرف تھا۔ ان میں سے مشہور لوگ یہ تھے۔ عباسؓ بن عبدالمطلب، فضل بن عباسؓ زبیرؓ بن عوام بن العاص، خالد بن سعیدؓ، مقداد بن عمروؓ، سلمان فارسیؓ، ابوذر غفاریؓ،

عمار بن یاسرؓ، براء بن حازبؓ، ابی بن کعبؓ۔ ابوبکرؓ نے عمرؓ، ابوعبیدہؓ بن جراح، مغیرہ بن شعبہؓ سے ان لوگوں کے بارے میں مشورہ کیا۔ تو انہوں نے جواب دیا کہ آپ عباسؓ بن عبدالمطلب سے ملئے اور خلافت میں ان کا حصہ بھی رکھ دیجئے جو ان کی اولاد کی طرف منتقل ہو جائے۔ اس طرح ان کے اور ان کے بھتیجے علیؓ بن ابی طالب کے درمیان اختلاف واقع ہو جائے گا اور یہ بات آپ کو علیؓ کے مقابلہ میں فائدہ مند ثابت ہو گی۔

اس مشورہ کے مطابق ابوبکرؓ عباسؓ سے ملے تو دونوں کے درمیان طویل گفتگو ہوئی۔ حضرت ابوبکرؓ نے کہا۔ ''آپ رسول اللہ ﷺ کے چچا ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ خلافت میں آپ کا حصہ بھی موجود ہو۔ جو آپ کے بعد آپ کی اولاد میں منتقل ہوتا رہے۔'' لیکن عباسؓ نے یہ پیشکش رد کر دی کہ اگر خلافت ہمارا حق ہے تو ہم ادھوری خلافت لینے پر رضامند نہیں ہو سکتے۔ (ابوبکرؓ۔ص 119)

اس کے بعد ہیکل لکھتا ہے:

ایک اور روایت میں جسے یعقوبی اور بعض دیگر مؤرخین نے بھی ذکر کیا ہے مذکور ہے کہ مہاجرین اور انصار کی ایک جماعت حضرت علیؓ کی بیعت کرنے کے ارادے سے حضرت فاطمۃ الزہراؓ بنت رسول اللہ ﷺ کے گھر میں جمع ہوئی۔ ان میں خالد بن سعیدؓ بھی تھے۔ خالدؓ نے حضرت علیؓ سے کہا:

''اللہ کی قسم! رسول اللہ ﷺ کی جانشینی کے لئے آپ سے بہتر اور کوئی آدمی نہیں۔ اس لئے آپ ہماری بیعت قبول کیجئے۔''

جب حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کو اس اجتماع کی خبر ملی تو وہ چند لوگوں کو لے کر حضرت فاطمہؓ کے گھر پہنچے اور اس پر حملہ کر دیا۔ حضرت علیؓ تلوار ہاتھ میں لے کر گھر سے باہر نکلے۔ سب سے پہلے ان کی مڈبھیڑ حضرت عمرؓ سے ہوئی۔ حضرت عمرؓ نے ان کی تلوار توڑ ڈالی اور وہ دوسرے لوگوں کے ہمراہ گھر میں داخل ہو گئے۔ اس پر حضرت فاطمہؓ گھر سے باہر آئیں اور کہا:

''یا تو تم میرے گھر سے نکل جاؤ ورنہ اللہ کی قسم میں اپنے سر کے بال نوچ لوں گی۔ اور تمہارے خلاف اللہ سے مدد طلب کروں گی۔'' حضرت فاطمہؓ کی زبان سے یہ الفاظ سن کر سب لوگ گھر سے باہر نکل گئے۔''

کچھ روز تک تو مذکورہ بالا اصحاب بیعت سے انکار کرتے رہے لیکن آہستہ آہستہ یکے بعد دیگرے سب نے بیعت کر لی۔ سوا حضرت علیؓ کے جنہوں نے چھ سات مہینے تک بیعت نہ کی۔ مگر حضرت فاطمہؓ کی وفات کے بعد انہوں نے بھی بیعت کر لی۔

ایک روایت میں ہے کہ حضرت علیؓ نے چالیس روز بعد بیعت کر لی تھی۔ ایک اور روایت میں یہ بھی مذکور ہے کہ حضرت عمرؓ نے ارادہ کر لیا تھا کہ اگر بنو ہاشم حضرت فاطمہؓ کے گھر میں خفیہ مجالس منعقد کرنے سے باز نہ آئے تو وہ ایندھن جمع کر کے گھر کو آگ لگا دیں گے۔ (ایضاً، ص 120)

اس وقت تک جو کچھ سامنے آیا ہے۔ اس میں یہ نہیں بتایا گیا کہ حضرت علیؓ نے اپنے مؤقف کی تائید میں دلیل کیا پیش کی تھی۔ اب وہ دلیل سنئے۔ ہیکل لکھتا ہے:

حضرت علیؓ کی دلیل

حضرت علیؓ اور دیگر بنی ہاشم کے بیعت نہ کرنے سے متعلق مشہور ترین روایت وہ ہے جو ابن قتیبہ نے اپنی کتاب ''الامامتہ والسیامتہ'' میں درج کی ہے۔ وہ یہ کہ حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کے بعد حضرت عمرؓ چند لوگوں کو ساتھ لے کر بنی ہاشم کے پاس گئے جو اس وقت حضرت علیؓ کے گھر جمع تھے تا کہ ان سے بھی بیعت کا مطالبہ کریں۔ لیکن سب لوگوں نے حضرت عمرؓ کا مطالبہ ماننے سے انکار کر دیا۔ زبیرؓ بن عوام تو تلوار ہاتھ میں لے کر حضرت عمرؓ کے مقابلہ کے لئے باہر نکل آئے۔ یہ دیکھ کر حضرت عمرؓ نے اپنے ساتھیوں سے کہا:

''زبیرؓ کو پکڑ لو۔''

لوگوں نے زبیرؓ کو پکڑ کر تلوار ان کے ہاتھ سے چھین لی۔ اس پر مجبوراً زبیرؓ نے جا کر حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کر لی۔ حضرت علیؓ سے بھی بیعت کرنے کا مطالبہ کیا گیا لیکن انہوں نے انکار کر دیا اور کہا۔ میں تمہاری بیعت نہ کروں گا کیونکہ میں تم سے زیادہ خلافت کا حقدار ہوں اور تمہیں میری بیعت کرنی چاہئے تھی۔ تم نے یہ کہہ کر انصار کی بیعت کرنے سے انکار کر دیا تھا کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے قریبی عزیز ہیں اور آپ کے قریبی عزیز ہی خلافت کے حقدار ہیں۔ اس اصول کے مطابق تمہیں چاہئے تھا کہ خلافت ہمارے حوالے کرتے مگر تم نے اہل بیت سے چھین کر خلافت غصب کر لی۔ کیا تم نے انصار کے سامنے یہ دلیل پیش نہ کی تھی کہ ہم خلافت کے زیادہ حقدار ہیں کیونکہ رسول اللہ ﷺ ہم میں سے تھے۔ اس لئے تم ہماری اطاعت قبول کرو اور خلافت ہمارے حوالے کرو؟ وہی دلیل

جوتم نے انصار کے مقابلے میں پیش کی تھی اب میں تمہارے مقابلے میں پیش کرتا ہوں۔ ہم تم سے زیادہ رسول اللہ ﷺ کے قریبی عزیز ہیں۔ اس لئے خلافت ہمارا حق ہے۔ اگر تم میں ذرہ برابر ایمان ہے تو ہم سے انصاف کر کے خلافت ہمارے حوالے کرو۔ لیکن اگر تمہیں ظالم بننا پسند ہے تو جو تمہارا جی چاہے کرو تمہیں اختیار ہے۔ (ایضاً، ص 122)

آپ نے غور فرمایا کہ تاریخ نے جو دلیل حضرت عمرؓ اور حضرت ابوبکرؓ کی طرف منسوب کی تھی (کہ خلافت قریش میں رہے گی اور ہم رسول اللہ ﷺ کے اہل خاندان ہیں) اسے (تاریخ نے) کس سادگی سے حضرت علیؓ کی طرف لوٹایا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دلیل کے بعد، سنی حضرات کا موقف اس قدر کمزور ہو جاتا ہے کہ ان سے کوئی اطمینان بخش جواب نہیں بن پاتا۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ (تاریخ نے) یہ دلیل اولاً حضرات شیخینؓ کی طرف کیوں منسوب کی تھی!

بہرحال، حضرت علیؓ کے اس جواب پر حضرت عمرؓ نے کہا:

میں اس وقت تک آپ کو نہ چھوڑوں گا جب تک آپ بیعت نہ کریں گے۔

(ایضاً، ص 122)

اس کے بعد:

سرگرمیاں

حضرت علیؓ اس وقت تیزی میں آ گئے اور کہنے لگے:

''عمرؓ تم شوق سے دودھ دوہو جس میں تمہارا بھی حصہ ہے آج تم اس لئے خلافتِ ابوبکرؓ کی حمایت کر رہے ہو کہ کل کو خلافت تمہارے پاس لوٹ آئے گی لیکن میں کبھی ان کی بیعت نہ کروں گا۔''

حضرت ابوبکرؓ کو ڈر پیدا ہوا کہ کہیں بات بڑھ نہ جائے اور درشت کلامی تک نوبت نہ آ جائے انہوں نے کہا۔ ''علیؓ! اگر تم بیعت نہیں کرتے

تو میں بھی تمہیں مجبور نہیں کرتا۔''

اس پر ابوعبیدہؓ بن الجراح حضرت علیؓ کی طرف متوجہ ہوئے اور نہایت نرمی سے کہا۔ بھتیجے! تم ابھی کم عمر ہو اور یہ لوگ بزرگ ہیں۔ نہ تمہیں ان جیسا تجربہ حاصل ہے اور نہ تم ان کی طرح جہاندیدہ ہو۔ اگر قوم میں کوئی شخص رسول اللہ ﷺ کی جانشینی کے فرائض صحیح طور پر بجالاسکتا اور خلافت کا بوجھ کما حقہٗ اٹھا سکتا ہے تو وہ صرف ابوبکرؓ ہیں اس لئے تم ان کی خلافت قبول کرلو۔ اگر تم نے لمبی عمر پائی تو یقیناً اپنے علم و فضل۔ دینی رتبے' فہم و ذکاء' سابقیتِ اسلام' حسب و نسب اور رسول اللہ ﷺ کی دامادی کا شرف حاصل ہونے کے باعث تمہیں خلافت کے مستحق ٹھہرو گے۔''

یہ سن کر حضرت علیؓ کے جوش کی انتہا نہ رہی اور وہ غصے سے بولے۔ ''اللہ اللہ اے گروہِ مہاجرین! تم رسول اللہ ﷺ کی حکومت کو آپ کے گھر سے نکال کر اپنے گھروں میں داخل نہ کرو۔ آپ کے اہلِ بیت کو ان کے صحیح مقام پر سرفراز کرو اور ان کا حق انہیں دو۔ اے مہاجرین! اللہ کی قسم! ہمی خلافت اور حکومت کے مستحق ہیں کیونکہ ہم اہل بیت ہیں۔ ہم اس وقت تک اس کے حقدار ہیں جب تک ہم میں اللہ کی کتاب کا قاری' دین کا فقیہہ' رسول اللہ ﷺ کی سنت کا عالم' رعایا کی ضرورت سے واقف' ان کی تکالیف کو دور کرنے والا اور ان سے مساوات کا سلوک کرنے والا قائم ہے اور اللہ جانتا ہے کہ ہم میں ان صفات کا حامل موجود ہے' اس لئے اپنی خواہشات کی پیروی کر کے اللہ کے راستے سے گمراہی اختیار نہ کرو اور حق کے راستے سے دور نہ چلے جاؤ۔'' راویوں کے بیان کے مطابق بشیر بن سعدؓ بھی اس موقع پر موجود تھے۔ جب انہوں نے حضرت علیؓ کی باتیں

سنیں تو کہا۔ ''اے علیؓ! اگر یہ باتیں جو اس وقت تم نے کہی ہیں انصار کا گروہ ابوبکرؓ کی بیعت سے پہلے سن لیتا تو وہ لوگ تمہارے سوا کسی کی بیعت نہ کرتے۔''

اس گفتگو کے بعد حضرت علیؓ طیش میں بپھرے ہوئے گھر چلے گئے۔ جب رات ہوئی تو وہ حضرت فاطمہؓ کو لے کر باہر آئے اور انہیں ایک خچر پر بٹھا کر انصار کے پاس لے گئے۔ حضرت فاطمہؓ گھر گھر جاتیں اور ان سے حضرت علیؓ کی مدد کرنے کی درخواست کرتیں لیکن ہر جگہ سے انہیں یہی جواب ملتا۔

''اے بنتِ رسول اللہ ﷺ! ہم ابوبکرؓ کی بیعت کر چکے ہیں۔ اگر آپ کے خاوند بیعت سے قبل ہمارے پاس آتے تو ہم ضرور ان کی بیعت کر لیتے۔''

یہ سن کر حضرت علیؓ غصہ میں آ کر جواب دیتے۔ ''کیا میں رسول اللہ ﷺ کی نعش کو بلا تجہیز و تکفین چھوڑ دیتا اور باہر نکل کر آپ کی جانشینی کے متعلق لڑتا جھگڑتا پھرتا؟''

حضرت فاطمہؓ بھی کہتیں۔ ''ابوالحسن (علیؓ) نے وہی کیا جو ان کے لئے مناسب تھا۔ باقی ان لوگوں نے جو کچھ کیا اللہ ان سے ضرور اس کا حساب لے گا اور باز پُرس کرے گا۔'' (ایضاً، ص 25-122)

ہیکل نے ان واقعات کو مختلف حوالوں سے نقل کیا ہے۔ اس باب میں بخاری میں حسبِ ذیل روایت آئی ہے:

بخاری کی حدیث

حضرت فاطمہؓ نبی ﷺ کے بعد چھ ماہ تک زندہ رہیں۔ جب ان کا انتقال

ہوا تو ان کے شوہر علیؓ نے رات کو ان کو دفن کر دیا اور ان کے انتقال کی ابوبکرؓ کو اطلاع نہیں دی بلکہ خود ہی نماز پڑھ لی اور جب تک حضرت فاطمہؓ زندہ رہیں لوگوں کی نگاہوں میں حضرت علیؓ کا ایک خاص وقار رہا لیکن جب حضرت فاطمہؓ کا انتقال ہو گیا تو حضرت علیؓ نے محسوس کیا کہ لوگوں کے چہرے اب بدل گئے ہیں تو اب انہوں نے حضرت ابوبکرؓ سے صلح کر لینے اور بیعت کرنے کی خواہش کی۔ ان چھ ماہ تک انہوں نے بیعت[1] نہیں کی تھی۔ چنانچہ انہوں نے ابوبکرؓ کے پاس پیغام بھیجا کہ آپ ہمارے پاس تشریف لائیے۔ مگر آپ کے ساتھ کوئی دوسرا شخص نہ آئے۔ حضرت علیؓ کو یہ بات گوارا نہیں تھی کہ وہ حضرت عمرؓ کو ساتھ لائیں۔ اس پر حضرت عمرؓ نے کہا۔ ''نہیں خدا کی قسم آپ ان کے ہاں تنہا نہیں جا سکیں گے۔ اس پر حضرت صدیقؓ نے کہا۔ تم کیا سمجھتے ہو۔ وہ میرا کیا کر لیں گے۔ خدا کی قسم میں ان کے پاس ضرور جاؤں گا۔ چنانچہ صدیق اکبرؓ تشریف لے گئے تو[2] حضرت علیؓ نے خطبہ پڑھا اور فرمایا۔'' ہم آپ کی فضیلت کو اور جو کچھ خدا نے آپ کو عطا کیا ہے اسے پہچانتے ہیں اور کسی بھلائی پر جو حق تعالیٰ آپ کو عطا فرمائے ہم حسد نہیں کرتے لیکن تم نے امر خلافت میں ہمارے خلاف استبداد سے کام لیا ہے۔ ہم سمجھتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ

1۔ بعینہٖ اسی سند کے ساتھ ابن جریر طبریؔ نے بھی اس روایت کو نقل کیا ہے۔ انہوں نے اس کے ساتھ اتنا اضافہ کیا ہے۔ ''معمرؔ کہتے ہیں کہ کسی نے ابن شہابؔ زہری سے پوچھا کہ کیا حضرت علیؓ نے چھ ماہ تک ابوبکرؓ کی بیعت نہیں کی تو انہوں نے جواب دیا کہ نہیں۔ نہ حضرت علیؓ نے بیعت کی اور نہ ہی بنو ہاشم میں سے کسی اور نے بیعت کی۔ حتیٰ کہ چھ ماہ بعد حضرت علیؓ نے بیعت کر لی تو بنو ہاشم نے بھی بیعت کر لی۔ (ابن جریر طبریؔ، جلد اول، حصہ سوم، اردو ترجمہ جامعہ عثمانیہ۔ ص 596)

2۔ ابن جریرؔ کی روایت کے مطابق حضرت علیؓ نے اس موقع پر تمام بنو ہاشم کو اپنے ہاں جمع کر لیا تھا۔ (ایضاً)

سے ہماری قرابت کی وجہ سے اس میں ہمارا حصہ ہے۔[1]
ظہر کی نماز پڑھنے کے بعد ابوبکرؓ صدیق منبر پر چڑھے اور خطبہ دیا' اور بیعت سے علیؓ کے تخلف کی صورت کو بیان کیا اور جو عذر انہوں نے بیان کیا تھا اسے پیش کیا پھر مغفرت کی دعا مانگی اور (اس کے بعد) حضرت علیؓ نے خطبہ پڑھا اور حضرت ابوبکرؓ کے حق عظمت کو بیان کیا اور کہا کہ اب تک انہوں نے جو کچھ کیا ہے وہ ابوبکرؓ سے کسی حسد کی بنا پر نہیں کیا اور نہ اس فضیلت سے کسی انکار کی بنا پر جو خدا نے انہیں دی ہے بلکہ ہم سمجھتے تھے کہ امر خلافت میں ہمارا حصہ ہے اور ابوبکرؓ نے ہمارے خلاف استبداد سے کام لیا ہے۔ لہٰذا ہم اپنے دلوں میں ناراض تھے۔

(صحیح بخاری' کتاب المغازی)

بخاری کی اس روایت میں چند باتیں بڑی غور طلب ہیں۔ مثلاً

(1) حضرت علیؓ حضرت ابوبکرؓ سے اس قدر ناراض تھے کہ انہوں نے حضرت فاطمہؓ کی وفات کی اطلاع تک نہیں دی اور چپکے ہی چپکے انہیں رات کو دفن کر دیا۔

(2) جب تک حضرت فاطمہؓ زندہ رہیں' حضرت علیؓ نے حضرت ابوبکرؓ کی بیعت نہ کی لیکن ان کی وفات کے فوری بعد انہوں نے محسوس کیا کہ لوگوں کی نظروں میں ان کا پہلا سا وقار باقی نہیں رہا۔ اس لئے انہوں نے یہی مناسب سمجھا کہ حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کر لی جائے۔

(3) حضرت علیؓ نے اپنے حق خلافت کے لئے یہ دلیل دی کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے قرابت دار ہیں۔

---

[1] ابن جریر طبریؒ نے اپنے ہاں یہ الفاظ نقل کئے ہیں کہ: **فلکنا کنا نریٰ ان لنا فی ھٰذا الامر حقافا ستبدرتم به علینا۔** یعنی ہم یہ سمجھتے تھے کہ امر خلافت ہمارا حق ہے اور تم نے ہمارے خلاف استبداد سے کام لیا ہے۔ (ایضاً)

آپ غور کیجئے کہ تاریخ کے اس بیان کو اگر صحیح تسلیم کرلیا جائے تو اس سے حضرت علیؓ کے متعلق کیا تصور قائم ہوتا ہے؟

صحابہؓ کا اِرتداد؟

تاریخ کے بیان کے مطابق، حضرت علیؓ نے یہ بھی کہا کہ جن لوگوں نے انہیں خلافت سے محروم رکھا ہے انہوں نے غصب اور استبداد سے کام لیا ہے۔ یہی وہ ''جرم'' ہے جس کی بنا پر شیعہ حضرات کا عقیدہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی وفات کے بعد، بجز چند اصحاب (جنہوں نے حضرت ابوبکرؓ کی بیعت نہیں کی تھی) باقی سب (معاذ اللہ) مرتد ہوگئے تھے۔ اس کے متعلق سُنّی حضرات یہ کہہ دیتے ہیں کہ یہ عقیدہ تعصب پر مبنی ہے لیکن اس کا کیا جواب کہ خود ان کی (حدیث کی) معتبر ترین کتاب، بخاری میں حسب ذیل روایت موجود ہے:

> حضرت ابنِ عباسؓ آنحضرت ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ تم لوگ برہنہ پا۔ برہنہ بدن۔ بغیر ختنہ کے حشر کئے جاؤ گے۔ آپ ﷺ نے یہ آیت پڑھی۔ كَمَا بَدَأْنَآ أَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيدُهُۥ ۚ وَعْدًا عَلَيْنَا ۚ إِنَّا كُنَّا فَٰعِلِينَ (21:104) اور قیامت کے دن سب سے پہلے جسے کپڑے پہنائے جائیں گے وہ ابراہیمؑ ہیں۔ اور اس دن میرے چند صحابہؓ بائیں جانب (یعنی جہنم کی طرف) لئے جا رہے ہوں گے۔ میں کہوں گا یہ تو میرے صحابہؓ ہیں۔ پھر اللہ فرمائے گا یہ لوگ اپنے پچھلے دین پر لوٹ گئے تھے[1]۔ جب سے آپ ان کے پاس سے جدا ہوئے۔ پس میں کہوں گا کہ نیک بندے (یعنی عیسیٰؑ) نے کہا تھا۔ وَكُنتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مَّا دُمْتُ فِيهِمْ ۖ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِى كُنتَ أَنتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ ۚ ..... (5:117)

(بخاری کتاب الانبیاء، ترجمہ شائع کردہ نور محمد، تاجر کتب، کراچی، جلد دوم، ص 149)

---

[1] بخاری کے اصلی الفاظ ''مرتدین علیٰ اعقابھم'' ہیں۔

سوچئے کہ بخاریؔ کی اس حدیث کی رو سے بات کہاں سے کہاں پہنچ جاتی ہے؟ یہ وہ صحابہؓ ہیں جن کے متعلق قرآن شہادت دیتا ہے کہ:

أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا ..... (8:74)

''یہی لوگ ہیں جو حقیقی مومن ہیں۔''

اگر ان مومنین کے ایمان کی بھی یہ کیفیت تھی کہ اُدھر رسول اللہ ﷺ نے آنکھیں بند کیں اور اِدھر یہ (معاذ اللہ) ایمان سے پھر گئے' تو بہ دیگراں چہ رسد؟ اور اگر کوئی معترض یہ کہہ دے (اور کہنے والے کہتے ہی ہیں) کہ ''درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے۔'' تو سوچئے کہ (ان روایات کی رُو سے) خود نبی اکرم ﷺ کے متعلق (معاذ اللہ) کیا تصور سامنے آتا ہے۔

تاریخ' دیؔن بن چکی ہے

اس مقام پر آپ کے دل میں یہ خیال پیدا ہوگا کہ جس تاریخ کی یہ کیفیت ہے اسے مسترد کیوں نہ کر دیا جائے؟ ایسا کرنے میں کونسا امر مانع ہے؟ یہ بات بڑی معقول ہے اور ایسا کرنے میں کوئی دِقت نہیں ہونی چاہئے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ہماری تاریخ کو تاریخ کے مقام سے اٹھا کر دیؔن بنا لیا گیا ہے۔ ان احادیث کے متعلق عقیدہ یہ ہے کہ یہ خدا کی طرف سے' رسول اللہ ﷺ کو بذریعہ وحی خفی ملی تھیں۔ اس لئے یہ قرآن کے ساتھ' قرآن کی مثل ہیں (مثلہٗ معہٗ) اتنا ہی نہیں' ان کے متعلق یہ بھی عقیدہ ہے کہ اگر قرآن اور حدیث میں تضاد نظر آئے تو قرآن کو منسوخ سمجھو اور حدیث کو برقرار رکھو۔ کراچی کے ''ادارۂ تحقیق حق'' کی طرف سے ایک پمفلٹ شائع ہوا ہے جس کا نام ہے ''فتنۂ انکارِ حدیث'' اس کے مصنف ہیں ''علامہ حافظ محمد ایوب صاحب دہلوی'' وہ اس پمفلٹ میں لکھتے ہیں:

اگر کوئی کہے کہ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ (5:48) کے کیا معنی ہیں۔
نبی سے یہ کہا جا رہا ہے کہ تو کتاب اللہ کے ساتھ ان کے درمیان فیصلہ کر۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ ''مَا أَنزَلَ اللّٰہ'' کے معنی صرف کتاب اللہ نہیں ہے۔ بلکہ ''مَا أَنزَلَ اللّٰہ'' کتاب اللہ بھی ہے اور حدیثِ رسول اللہ ﷺ بھی۔ (ص52)

اس کے بعد لکھتے ہیں:

حدیث، قرآن کو منسوخ کر دیتی ہے

رہی یہ بات کہ قولِ رسول ﷺ قرآن کے خلاف ہو تو وہ بھی حجت ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ قرآن میں ہے: **كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا ۖ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ**.....(2:180)۔ تمہارے اوپر والدین کی وصیت فرض ہے۔ اگر کسی نے مال چھوڑا ہے جب کہ اسے موت آئے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ **لا وصیة للوارث**۔ وارث کے لئے وصیت نہیں اور تواتر سے ثابت ہے کہ عمل اسی حدیث پر رہا ہے۔ یعنی وارث کے لئے وصیت ناجائز قرار دی گئی۔ حدیث نے قرآن کی آیت کو منسوخ کر دیا اور قولِ رسول ﷺ قرآن کی آیت کے خلاف حجت اور موجبِ عمل رہا۔ (ص85)

اس کے بعد لکھتے ہیں:

اب اگر کہا جائے کہ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ رسول ﷺ کا کوئی قول قرآن کے خلاف ہو اور رسول ﷺ کا قول قرآن کو فسخ کر دے! تو پہلے یہ سمجھ لینا چاہئے کہ رسول ﷺ کا قول اس کا اپنا قول نہیں ہوتا۔ وہ درحقیقت خدا کا قول ہوتا ہے۔ جس طرح قرآن خدا کا قول ہے اسی طرح رسول ﷺ کا قول بھی خدا کا قول ہے۔ اور جس طرح قرآن کی ایک آیت قرآن کی

دوسری آیت کو منسوخ کر دیتی ہے۔ اسی طرح خدا کا ایک قول (یعنی قولِ رسول ﷺ) دوسرے قول (یعنی قرآن) کو منسوخ کر دیتا ہے۔

(ص 86)

ہم نے یہ کہا تھا کہ ہمیں چاہئے کہ ہم قرنِ اول (عہدِ محمد رسول ﷺ اللہ والذین معہٗ) کی تاریخ[1] کے ذخیرہ کو قرآن کی روشنی میں پرکھ لیں۔ جو باتیں قرآن کے مطابق ہوں انہیں صحیح تسلیم کر لیا جائے۔ جو اس کے خلاف ہوں انہیں مسترد کر دیا جائے۔ اس کے جواب میں حافظ ایوب صاحب نے فرمایا:

قرآن اور حدیث میں اختلاف ہوسکتا ہے

جس طرح خدا کے قول کے حجت ہونے میں یہ شرط نہیں کہ وہ عقل کے مطابق ہو۔ بالکل اسی طرح نبی ﷺ کے قول کے حجت ہونے میں یہ شرط نہیں ہے کہ وہ قرآن کے مطابق ہو۔ اس لئے کہ نبی کا قول بھی قول اللہ ہے اور قرآن بھی قول اللہ ہے اور اللہ کے دونوں قول ہیں۔ قرآن بھی اور حدیثِ رسول بھی۔ تو اللہ کے قول کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ اس میں تنوع نہ ہو۔ جس طرح کہ اس کے ایک فعل کے لئے ضروری نہیں ہے کہ وہ دوسرے فعل کے مطابق ہو۔ ایک طرف پہاڑ کی چوٹی فلک تک پہنچ

---

[1] جیسا کہ ہم نے شروع میں لکھا ہے، قرنِ اول کی تاریخ کا کچھ حصہ کتبِ احادیث میں ہے اور کچھ حصہ کتبِ سیر و آثار میں۔ کتبِ احادیث کو قرآن کے ہم پایہ بلکہ قرآن کا ناسخ ماننے والوں پر یہ بات بھی گراں گزرتی ہے کہ حدیث کو تاریخ کہہ دیا جائے۔ حالانکہ یہ ظاہر ہے کہ واقعہ خلافت اول کے متعلق بخاری کی جو احادیث سابقہ صفحات میں درج کی گئی ہیں وہ اگر تاریخی بیانات نہیں تو اور کیا ہیں۔ پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ خود امام بخاری نے اپنی اس کتاب (مجموعہ احادیث) کا نام "الجامع الصحیح المسند المختصر من امور رسول ﷺ الله و ایامه" رکھا تھا (بحوالہ "تدوین حدیث" مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم) اس سے واضح ہے کہ خود امام بخاری کے نزدیک ان کی کتاب تاریخ کی کتاب تھی۔

رہی ہے۔ دوسری طرف کھڈ کی گہرائی تحت الثریٰ تک پہنچ رہی ہے۔ جس طرح اس کے ایک فعل کا دوسرے فعل کے مطابق ہونا ضروری نہیں ہے۔ اسی طرح اس کے ایک قول کا (یعنی حدیثِ رسول ﷺ کا) اس کے دوسرے قول (یعنی قرآن) کے مطابق ہونا ضروری نہیں ہے۔ (ص51)

ایک حدیث ہے جس میں کہا گیا ہے:

یکثر لکم الاحادیث من بعدی. فاذا روی عنی حدیث فاعرضوہ علیٰ کتاب اللہ. فما وافق فاقبلوہ. وما خالف فردوہ۔ (بحوالہ کتاب التوضیح والتلویح۔ص480)

یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ:

''میرے بعد تم سے بہت سی احادیث بیان کی جائیں گی۔ سو جب کوئی حدیث میری طرف سے روایت کی جائے تو اسے کتاب اللہ کے سامنے پیش کرو جو اس کے موافق ہو اسے قبول کرلو۔ جو اس کے خلاف ہو اسے رَد کردو۔''

اس حدیث کے صحیح ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہوسکتا۔ اس لئے کہ یہ قرآن کی تعلیم کے عین مطابق ہے۔ نبی اکرم ﷺ کا کوئی ارشاد قرآن کے خلاف ہو نہیں سکتا۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ ان حضرات کی طرف سے اس کا کیا جواب ملا؟ جماعتِ اہل حدیث کے ترجمان ماہنامہ 'رحیق' نے اپنی اپریل 1958ء کی اشاعت میں لکھا:

حدیث کو قرآن کے مطابق ہونا چاہئے یہ عقیدہ مُلحِدوں کا ہے!

اس حدیث کو ملحدوں نے وضع کیا تھا اور انہی ملحدوں کے خیالات کی خوشہ

چینی بکواس ازم کے یہ ممبران کر رہے ہیں۔امام خطابیؒ اس حدیث کے متعلق فرماتے ہیں:

وضعه الزنادقة الذين مقصودهم افساد الدين ويدفعه قوله صلى الله عليه وسلم انى اوتيت الكتاب و مثله معه۔

(ظفر الامانی علی مختصر الجرجانی۔ص267)

یعنی ''یہ روایت ان زندیقوں اور حدیث دشمنوں کی خود ساختہ حدیث ہے جن کا مقصد احادیث کو رد کر دینے سے دینی نظام کا فاسد و باطل کر دینا ہے اور اس حدیث کا بطلان آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد سے خود ہو جاتا ہے جس میں ارشاد ہے کہ میں قرآن دیا گیا ہوں اور قرآن کے مانند بھی دیا گیا ہوں۔پس ''حدیث'' ہی قرآن کی مانند ہے۔کیونکہ دوسری روایت میں تشریح ہے کہ ''قرآن کے مانند'' کا نام ''حدیث'' ہے۔وہ روایت یہ ہے:

لا الفين احدكم متكئاً علىٰ اريكته يصل اليه عنى الحديث فيقول لانجد هٰذا الحكم فى القراٰن الاوانى اوتيت القراٰن و مثله و معه۔ (ظفر الامانی،ص267)

دوسری حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

ليوشك الرجل متكئاً علىٰ اريكته يحدث بحديثى فيقول بيننا و بينكم كتاب الله الحديث۔

(دارمی،جلد اول،طبع مصر،ص140)

اس قسم کی روایات الکفایہ (ص1009) میں خطیبؒ نے ذکر کی ہیں جن میں صاف تصریح ہے کہ حدیث کو رد نہ کرو۔مجھے قرآن کی طرح اور اس کی مانند ''حدیث'' بھی دی گئی ہے۔امام خطابیؒ کی طرح امام شافعیؒ۔۔ امام المحدثین عبدالرحمٰنؒ ابن مہدی وغیرہ نے بھی اس حدیث کو زندیقوں کا

وضع کردہ لکھا ہے۔ امام بیہقیؒ نے بھی فرمایا ہے کہ جو روایت سنتِ نبویہ ﷺ کو قرآن پر پیش کرنے کی خاطر بنائی گئی ہے وہ باطل ہے۔ علامہ ہیثمیؒ نے لکھا ہے کہ اس میں ایک راوی متروک منکر الحدیث ہے۔ (مجمع الزوائد، جلد اول، ص 68)

یعنی یہ مسلک کہ جو کچھ قرآن کے مطابق ہو اسے صحیح سمجھو۔ جو اس کے خلاف ہو، اسے غلط قرار دو، (ان حضرات کے نزدیک) ملحدین اور زنادقہ کا وضع کردہ ہے!

خرد کا نام جنوں رکھ دیا، جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

گذشتہ اوراق جو آپ کی نظروں سے گذرے ہیں، ان سے یہ حقیقت آپ کے سامنے آ چکی ہے کہ ہماری کتبِ احادیث و سیر و آثار میں ایسی باتیں موجود ہیں جو

(1) قرآنِ کریم کی واضح تعلیم کے یکسر خلاف ہیں۔
(2) جن سے نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ گرامی پر حرف آتا ہے۔
(3) جن سے صحابہ کبارؓ کی سیرت و کردار مطعون ہو جاتے ہیں۔
(4) جو علم و عقل کے بھی خلاف ہیں۔

اس کے بعد آپ کے دل میں لازماً یہ سوال ابھرے گا کہ:

یہ کیسے ہوا

(الف) اس قسم کی باتیں ان کتابوں میں آ کیسے گئیں؟

(ب) ہزار برس سے یہ متواتر آگے منتقل کیسے ہوتی رہیں۔ یعنی لوگوں نے اس قسم کی باتوں کو ان کتابوں سے خارج کیوں نہ کر دیا؟ اور

(ج) آج بھی ہمارا قدامت پرست طبقہ ان باتوں کو صحیح ماننے اور صحیح منوانے پر اس قدر مصر

کیوں ہے؟ اور

یہ سوالات ہر اس شخص کے دل میں پیدا ہونے چاہئیں جو ذرا بھی عقل و بصیرت سے کام لے اور ان امور پر غور و فکر کرے۔ جہاں تک پہلی دو شقوں کا تعلق ہے (یعنی اس قسم کی باتیں ہمارے لٹریچر میں آ کیسے گئیں اور قوم نے انہیں ان کتابوں سے خارج کیوں نہ کر دیا؟) اس کے متعلق تفصیلی بحث کی ضرورت ہے اور اس کے لئے مناسب موقع وہ ہے جب ہم اپنی پوری تاریخ کا ازسرِ نو جائزہ لیں اور اس کے ایک ایک گوشے کے متعلق ریسرچ کریں۔۔۔ ظاہر ہے کہ ایک مقالہ میں اس کی گنجائش نہیں ہو سکتی۔ ہم سرِ دست صرف اس نکتہ کو پیش کریں گے کہ آج بھی اس قسم کی باتوں کو صحیح ماننے اور صحیح منوانے پر اس قدر زور کیوں دیا جا رہا ہے؟ اس نقطہ کی وضاحت ایک واقعہ سے ہو جائے گی۔ اسے غور سے سنئے۔

> 1958ء کی بات ہے کہ جماعتِ اسلامی کے اربابِ بست و کشاد کا ایک حلقہ ..... جماعت سے الگ ہو گیا۔ ان الگ ہونے والے حضرات نے اپنی علیحدگی کی وجوہات میں ایک بڑی وجہ یہ بتائی تھی کہ جماعت کے دعوتی اور اشاعتی دَور میں جن اصولوں کو دین کی محکم اساس کے طور پر پیش کیا جاتا تھا' نظام کے عملی قیام کے وقت ان سے انحراف کیا جا رہا ہے[1]۔ ظاہر ہے کہ یہ اعتراض بڑا وقیع اور یہ جرم بڑا سنگین تھا لیکن (مرحوم) مودودی صاحب نے اس کے جواب میں کہا کہ میں نے یہ کونسا انوکھا کام کیا ہے۔

ایسا (معاذ اللہ) رسول ﷺ اللہ نے بھی کیا تھا!

(معاذ اللہ۔ معاذ اللہ) خود نبی اکرم ﷺ نے اسلام کے اشاعتی دور میں جو اصول بیان

1۔ ان تفاصیل کے لئے المنبر' لائل پور' بابت 31 جنوری 1958ء اور طلوعِ اسلام بابت مارچ و جولائی 1958ء ملاحظہ فرمائیے۔

فرمائے تھے اس کے عملی قیام کے وقت ان میں لچک پیدا کر لی تھی۔ مثلاً

اسلامی نظام کے اصولوں میں سے ایک یہ بھی تھا کہ تمام نسلی اور قبائلی امتیازات کو ختم کر کے اس برادری میں شامل ہونے والے سب لوگوں کو یکساں حقوق دیئے جائیں اور تقویٰ کے سوا فرق مراتب کی کوئی بنیاد نہ رہنے دی جائے۔ اس چیز کو قرآن مجید میں بھی پیش کیا گیا اور حضور ﷺ نے بھی بار بار اس کو نہ صرف زبانِ مبارک سے بیان فرمایا بلکہ عملاً موالی اور غلام زادوں کو امارت کے مناصب دے کر واقعی مساوات قائم کرنے کی کوشش بھی فرمائی۔ لیکن

جب پوری مملکت کی فرمانروائی کا مسئلہ سامنے آیا تو آپ نے ہدایت دی کہ "الائمة من قریش" امام قریش میں سے ہوں۔

ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ اس خاص مسئلہ میں یہ ہدایت مساوات کے اس عام اصول کے خلاف پڑتی ہے جو کلیہ کے طور پر پیش کیا گیا تھا۔

آپ نے غور فرمایا کہ اس وضعی روایت سے جو ہماری کتبِ تاریخ میں درج ہے (اور جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے) مودودیؔ (مرحوم) نے کس طرح فائدہ اٹھایا۔ ظاہر ہے کہ اگر معاملہ صرف قرآن تک رہتا اور دین میں اسی کو سند مانا جاتا تو مرحوم کو اپنی روش کی تائید میں کوئی دلیل و سند نہ مل سکتی۔ لیکن چونکہ تاریخ کو (قرآن کے برابر بلکہ اس سے بھی افضل) سند مان لیا گیا ہے اور اس میں ہر قسم کا رطب و یابس مسالہ موجود ہے۔ اس لئے اس سے ہر شخص کو اس کے ہر فیصلے اور عمل کی سند مل سکتی ہے۔

جماعت سے الگ ہونے والوں نے اس کے جواب میں کہا:

غور فرمائیے۔ اگر یہ طریقِ کار خدا کے آخری نبی ﷺ نے اختیار فرمایا تھا اور اگر اسلامی تحریک اس اسوۂ حسنہ کے مطابق اس طریقِ کار کو اپنا معمول

بناتی ہے اور ہر کوئی ایسی جماعت جو اقامتِ دین کی علمبردار ہو وہ اس اصول کو بطور فلسفہ اور عقیدہ کے طے کر لیتی ہے کہ اسلامی نظام کے دعوتی اور اشاعتی دور میں جو اصول بیان کئے جائیں اور جن پر لوگوں کو جمع کیا جائے۔ جب اسلامی نظام کو عملاً قائم کرنے کا وقت آئے گا تو اس تحریک کے قائد کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ توحید و رسالت ایسے اساسی اصولوں کے علاوہ، تحریک کے مفاد کے لئے جس اصول میں ضروری خیال کرے استثناء پیدا کر لے۔ اس پر عمل کرنے سے اپنی جماعت کو روک دے۔ جو ضمانت اس تحریک نے عوام کو اپنے ابتدائی دور میں دی ہو اس میں سے جس جزو کو وہ دین کی مصلحت کے لئے مُضر خیال کرے ساقط کر دے (جیسا کہ مبینہ مثال میں حضور ﷺ نے مساوات اور حقِ خلافت ایسے اصول اور ضمانت پر صحابہؓ کو عمل کرنے سے روک دیا تھا) تو اس اسلامی تحریک اور اقامتِ دین کی جدوجہد اور ان طالع آزما سیاست دانوں کی تحریکات کے مابین کیا فرق باقی رہ جائے گا جو حصولِ اقتدار سے پہلے نہایت پاکیزہ اصول بیان کرتے ہیں۔ بہت حسین وعدے عوام سے کرتے ہیں اور انہی اصولوں اور وعدوں کی بنیاد پر وہ لوگوں کی حمایت و تائید حاصل کرتے ہیں۔ جب انہیں اقتدار حاصل ہو جاتا ہے تو وہ اقتدار کو قائم رکھنے کی عملی مشکلات سے مجبور ہو کر ان وعدوں اور اصولوں کی خلاف ورزی پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

جھوٹ بولنا بھی جائز ہے

اس پر مودودیؒ (مرحوم) ایک قدم اور آگے بڑھے اور فرمایا کہ اقامتِ دین جیسے اہم مقصد کے حصول کے لئے اصولوں میں لچک اور استثنیٰ تو ایک طرف ان کے لئے جھوٹ بولنا بھی نہ صرف

جائز بلکہ ضروری ہو جاتا ہے۔ انہوں نے کہا:

> راست بازی اور صداقت شعاری اسلام کے اہم ترین اصولوں میں سے ہے اور جھوٹ اس کی نگاہ میں ایک بدترین برائی ہے۔ لیکن عملی زندگی کی بعض ضرورتیں ایسی ہیں جن کی خاطر جھوٹ کی نہ صرف اجازت ہے بلکہ بعض حالات میں اس کے وجوب تک کا فتویٰ دیا گیا ہے۔

(ترجمان القرآن۔ مئی 1958ء)

حدیث سے اس کا ثبوت

آپ حیران ہوں گے کہ مرحوم نے ایسا کہنے کی جرأت کیسے کر لی اور اس کی تائید میں ان کے پاس کون سی سند ہو سکتی تھی؟ لیکن جس تاریخ سے انہوں نے پہلی سند پیش کی تھی اسی سے انہیں اس کی سند بھی مل گئی۔ چنانچہ انہوں نے ''جھوٹ کے وجوب'' میں دو تین حدیثیں نقل کر دیں۔ جن میں سے ایک یہ تھی کہ:

> اسماء بنت یزید نبی اکرم ﷺ سے روایت کرتی ہیں کہ جھوٹ جائز نہیں ہے۔ مگر تین چیزوں میں۔ مرد کی بات عورت سے تاکہ وہ اسے راضی کرے۔ جنگ اور اصلاحِ بین الناس۔

(ترمذی)

اس کے بعد انہوں نے (معاذ اللہ) نبی اکرم ﷺ کے اسوۂ حسنہ سے بھی اس کی مثالیں پیش کر دیں۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:

> اس کی عملی مثالیں بھی احادیث میں موجود ہیں۔ کعب بن اشرف کے قتل کے لئے محمد بن مسلم کو جب حضور ﷺ نے مامور کیا تو انہوں نے اجازت مانگی کہ اگر کچھ جھوٹ بولنا پڑے تو بول سکتا ہوں؟ حضور ﷺ نے بالفاظِ صریح انہیں اس کی اجازت دی۔ (بخاری)

اسلام اور نظامِ سرمایہ داری

امید ہے کہ اس سے یہ بات آپ کی سمجھ میں آ گئی ہوگی کہ یہ حضرات تاریخ اور روایات کے اس قسم کے بیانات اور واقعات کو (جن کا خلافِ قرآن اور غلط ہونا بدیہیات میں سے ہے) سچا اور دین میں سند تسلیم کرانے پر کیوں زور دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ (جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے) اگر سند قرآن رہے اور اس اصول کو تسلیم کرا لیا جائے کہ قرنِ اول کی تاریخ کا جو بیان قرآن کے خلاف ہے وہ غلط ہے' تو کسی کو اپنی فریب کاریوں اور کذب تراشیوں کے لئے دینی سند نہیں مل سکتی۔ ایسا اسی صورت میں ہوسکتا ہے جب اس قسم کے تاریخی بیانات کو دین میں سند تسلیم کرا لیا جائے اور پھر انہیں اپنے فیصلوں کی تائید میں پیش کر دیا جائے۔ اس سے ہمارا مطلب یہ نہیں کہ اس طبقہ کے تمام افراد اسی جذبہ کے تحت ان باتوں کو صحیح مانتے اور صحیح منواتے ہیں۔ ان میں بیشتر حصہ ان افراد پر مشتمل ہے جو ان باتوں کو نیک نیتی سے سچا مانتا ہے۔ یہ اس لئے کہ صدیوں کی تقلید سے ان میں سمجھنے اور سوچنے کی صلاحیت باقی نہیں رہی۔ ان کے نزدیک دین کے معاملات میں غور وفکر سے کام لینا جائز نہیں۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ جو کچھ ہوتا چلا آ رہا ہے وہی صحیح ہے اس پر کسی قسم کی تنقید نہیں کی جا سکتی۔ یہ حضرات اس تاریخ کی حفاظت وترویج کو عین دینی خدمت سمجھتے ہیں۔ مفاد پرست طبقہ اس سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ یہی وہ طبقہ ہے جس نے اس قسم کی باتیں وضع کر کے انہیں ابتداء ہماری تاریخ میں شامل کیا تھا۔ یہی اسے صدیوں سے مسلسل ومتوارث آگے بڑھائے چلا آ رہا ہے اور یہی آج اس کے تحفظ کا سب سے بڑا علمبردار بن کر سامنے آتا ہے۔ اس کی ایک مثال سنئے۔ ہم شروع میں بتا چکے ہیں کہ قرآن نے جس نظام کو الدین کہا ہے اس میں فاضلہ دولت کسی کے پاس جمع نہیں رہتی۔ وہ نوعِ انسانی کی بہبود کے لئے امت (یا نظام) کی تحویل میں چلی جاتی ہے۔ اس باب میں قرآن کی تعلیم ایسی واضح' بین اور صاف ہے کہ اس میں کسی قسم کی تاویل وتعبیر کی گنجائش نہیں۔ ظاہر ہے کہ عہدِ محمد رسول اللہ ﷺ والذین معہٗ (رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین) میں قرآن کی اسی تعلیم پر عمل ہوتا رہا۔ لیکن اس کے بعد جب خلافت ملوکیت میں بدل گئی

اور سرمایہ دارانہ نظام ہجوم کر کے آ گیا تو اس کی ضرورت پڑی کہ اس کی تائید اور جواز کے لئے سندیں وضع کی جائیں۔ یہ اسناد قرآن سے تو مل نہیں سکتی تھیں کیونکہ اس میں تغیر وتبدل اور حک و اضافہ کی گنجائش نہیں تھی۔ اس کے لئے تاریخ کا چور دروازہ ہی کام دے سکتا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اس سے کام لیا اور اس قسم کی روایات وضع کیں۔ جن سے نظامِ سرمایہ داری، زمینداری اور جاگیرداری کا نظام عین مطابقِ سنتِ رسول اللہ ﷺ وسنتِ صحابہؓ قرار پا جائے۔ مثلاً ایک روایت میں ہے:

مشکوٰۃ کی ایک حدیث

ابنِ عباسؓ کہتے ہیں کہ جس وقت یہ آیت نازل ہوئی .....

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (9:34)

''جو لوگ سونے اور چاندی کو جمع کرتے ہیں اور اسے خدا کی راہ میں کھلا نہیں رکھتے۔ اے رسول ﷺ تو انہیں دردناک عذاب سے آگاہ کر دے۔''

تو مسلمانوں پر اس کا خاص اثر ہوا یعنی انہوں نے اس حکم کو گراں خیال کیا۔ حضرت عمرؓ نے لوگوں سے کہا کہ میں تمہاری اس فکر کو دُور کر دُوں گا اور اس مشکل کو حل کروں گا۔ پس عمرؓ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا' یا نبیؐ اللہ یہ آیت آپ ﷺ کے صحابہؓ پر گراں ہوئی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا خداوند تعالیٰ نے زکوٰۃ اس لئے فرض کی ہے کہ وہ تمہارے باقی مال کو پاک کر دے اور میراث کو اس لئے فرض کیا ہے کہ جو لوگ تمہارے بعد رہ جائیں ان کو مال مل جائے۔ ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ کا یہ بیان سن کر عمرؓ نے جوشِ مسرت سے اللہ اکبر کہا۔

اس کے بعد حضور ﷺ نے فرمایا کہ میں تم کو ایک ایسی بہترین چیز کا پتہ نہ دوں جس کو انسان جمع کر کے خوش ہو اور وہ چیز نیک بخت عورت ہے۔ اس کی طرف مرد دیکھے تو اس کا دل خوش ہو اور جب مرد اس کو کوئی حکم دے تو وہ اس کی اطاعت کرے اور جب وہ غائب ہو تو اس کے مال و دولت کی حفاظت کرے۔ (ابوداؤد)' (مشکوٰۃ' جلد اول' اردو ترجمہ' ص 309)

یہ روایت زبانِ حال سے پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ یہ وضع کردہ ہے۔ یہ کبھی تصور میں بھی نہیں آ سکتا ہے کہ خدا کا ایک حکم ہو اور صحابہؓ پر وہ گراں گذرے؟ پھر ان میں سے (کوئی اور بھی نہیں) حضرت عمرؓ اس حکم کو بدلوانے کے لئے رسول اللہ ﷺ کے پاس جائیں۔ اور رسول اللہ ﷺ خدا کے اس حکم کو یوں بدل دیں کہ اگر تم اڑھائی فیصد سالانہ ادا کر دو تو تمہیں اجازت ہے کہ سونے چاندی کے ڈھیر جمع کرتے رہو۔ روایت کا انداز بتا رہا ہے کہ یہ بعد کے دور کی وضع کردہ ہے۔ لیکن چونکہ اس سے سرمایہ دارانہ نظام کا تحفظ ہوتا ہے اس لئے مفاد پرست گروہ اسے صحیح ترین حدیث قرار دے کر برابر آگے بڑھائے چلا جا رہا ہے۔ اسی قسم کی روایات ہیں جو آج بھی سرمایہ داری۔ زمینداری اور جاگیرداری کی تائید میں بڑھ چڑھ کر پیش کی جاتی ہیں اور جب کوئی یہ کہے کہ یہ چیزیں قرآن کے خلاف ہیں تو اسے یہ کہہ کر چپ کرا دیا جاتا ہے کہ تم قرآن کو زیادہ سمجھتے ہو یا رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کبارؓ زیادہ سمجھتے تھے!

چونکہ اس مقالہ میں پوری تاریخ کا استقصاء مقصود نہیں اس لئے ہم انہی مثالوں پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔ آپ ان واقعات کو پھر سے سامنے لائیے جو خلیفہ اول کے انتخاب کے ضمن میں ہماری کتبِ احادیث و آثار میں بیان ہوئے ہیں اور پھر سوچئے کہ اگر اس تاریخ کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو دنیا میں اسلام اور متبعین اسلام کی پوزیشن کیا رہ جاتی ہے؟

پس چہ باید کرد؟

سوال یہ ہے کہ ان حالات میں کیا کیا جائے؟ اس کا جواب آسان ہے یعنی:

(1) ہمارا ایمان ہے کہ قرآنِ کریم خدا کی کتاب ہے جو حرفاً حرفاً اپنی حقیقی شکل میں ہمارے پاس موجود ہے۔

(2) رسول اللہ ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ کبارؓ کی زندگی قرآن کے مطابق تھی۔ لہٰذا

(3) اگر اس دَور کی تاریخ میں ہمیں کوئی بات ایسی ملے جو قرآنی تعلیم کے خلاف ہے تو ہمیں بلا تامل کہہ دینا چاہئے کہ تاریخ کا وہ بیان غلط ہے۔ خواہ وہ حدیث کے کسی مجموعہ میں ہو، یا کسی اور کتاب میں۔

(4) مندرجہ بالا اصول کی روشنی میں ہمیں قرنِ اول کی تاریخ کو از سرِ نو مرتب کرنا چاہئے۔ اس تاریخ سے یہ معلوم ہو سکے گا کہ اس دَور میں قرآنِ کریم پر اس طرح عمل ہوا تھا۔

(5) اس دَور کے بعد قرآنی نظام باقی نہیں رہا تھا، اس لئے اس وقت سے آج تک کی تاریخ مسلمان قوم کی تاریخ ہے۔ یہ تاریخ نہ اسلام کی صحیح تعبیر کہلا سکتی ہے، نہ ہمارے لئے دلیل اور حجت بن سکتی۔ نہ ہی ہمارے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم ان لوگوں کی مدافعت میں اپنا وقت اور توانائیاں صرف کریں۔ جنہیں اسلاف کہا جاتا ہے ان کے متعلق ہم اس سے زیادہ ماننے کے مکلّف نہیں کہ

تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۖ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۖ وَلَا تُسْـَٔلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ (2:141)

یہ وہ لوگ ہیں جو گذر چکے ہیں۔ انہوں نے جو کچھ کیا اس کا نتیجہ ان کے لئے تھا۔ تم جو کچھ کرو گے اس کا نتیجہ تمہارے لئے ہوگا۔ تم سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ انہوں نے کیا کیا تھا؟

(6) جہاں تک قرآنِ کریم کے سمجھنے کا تعلق ہے اسے ہر زمانہ میں براہِ راست سمجھا جا سکتا

ہے۔ دین میں سند اور حجت قرآن ہے اور یہی ہمارے لئے غلط اور صحیح حق اور باطل کا معیار ہے۔ جو اس کے مطابق ہے وہ حق ہے جو اس کے خلاف ہے وہ باطل ہے۔ جب تک ہم اس مسلک پر عمل پیرا نہیں ہوتے' دین ہمارے سامنے نہیں آ سکتا۔

تکملہ:۔ یہ مقالہ آج سے قریب بائیس سال[1] پہلے کا نوشتہ ہے۔ اسے اس موقعہ پر دوبارہ شائع کرنے کا ایک خاص مقصد ہے۔ آج کل ہمارے ہاں ''اسلامی نظام'' کا خاص چرچا ہے اور اس موضوع پر بڑی کثرت سے لکھا اور کہا جا رہا ہے۔ ان میں سے ہر محقق کی تان اس پر ٹوٹتی ہے کہ اسلامی نظام کا جو نقشہ صدرِ اول میں قائم ہوا تھا' ہمیں اسی قسم کا نظام اپنے ہاں قائم کرنا چاہئے۔ اس کے لئے ہر ایک' اپنے اپنے نقشہ کی تائید میں تاریخی شواہد پیش کرتا ہے' اور چونکہ ان نقشوں میں باہمی اختلاف ہوتا ہے اس لئے ملک میں عجیب قسم کا ذہنی انتشار پیدا ہو رہا ہے۔ اندریں حالات' ہم نے مناسب سمجھا کہ صدرِ اول کی جو تاریخ ہم تک پہنچی ہے اس کی ایک خفیف سی جھلک قوم کے سامنے لائی جائے تاکہ اسے اندازہ ہو جائے کہ روایات کی طرح تاریخ بھی یقینی ذریعہ علم نہیں۔

یاد رکھئے! دین کے متعلق یقینی اور مبنی بر حقیقت علم' خدا کی کتاب (قرآنِ مجید) کے اندر محفوظ ہے جس میں ایک حرف کا بھی تغیر و تبدل نہیں ہوا۔ اس لئے وہی نظریہ' عقیدہ' مسلک' قانون یا نظام اسلامی کہلا سکتا ہے جس کی سند قرآن سے حاصل ہو۔

حق وہی ہے جو قرآن کے مطابق ہے۔ جو اس کے خلاف ہے وہ باطل ہے خواہ اس کی نسبت کسی کی طرف کیوں نہ کر دی جائے۔ اس مقالہ میں بھی جو تاریخی بیانات قرآن کے خلاف ہیں' انہیں ہم وضعی قرار دیتے ہیں۔

1۔ یہ مقالہ پرویز صاحب نے 1981ء میں دوبارہ شائع کیا تھا۔ اس لحاظ سے آج 2009ء میں تقریباً پچاس برس پہلے کا نوشتہ ہے۔ (مدیر)